POSTED AT LPC Delhi RMS
ON 10-11 March 2026, R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) - 01/1195/2024-26, Licensed to Post
Without Prepayment U (C) - 160/2024-26, ISSN 2456-8511

Total Pages
8

HAMARI
ZABAN
(Weekly)

ہفت روزہ
ہماری زبان
اشاعت کا 87 واں سال

Date of Publication: 09-03-2026 • Price: 5/- • 15-21 March 2026 • Issue: 11 • Vol:85

۱۵ تا ۲۱ مارچ ۲۰۲۶ء • شمارہ: ۱۱ • جلد: ۸۵

’اسلام اور عصرِ جدید‘ پر ایک نظر

ڈاکٹر عامر فہیم

پروفیسر اختر الواسع اپنے علمی وفکری رجحانات کے سبب اسلامی اور اردو ادب میں اپنا ایک مستحکم انفراد رکھتے ہیں۔ جس دوران وہ ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، نئی دہلی کے ڈائرکٹر کے باوقار عہدے پر فائز تھے، ان دنوں انسٹی ٹیوٹ کے موقر علمی، فکری اور ادبی رسائل ’رسالہ جامعہ‘ اور ’اسلام اور عصرِ جدید‘ ان کی ہی ادارت میں شائع ہوتے تھے۔ دونوں رسائل کے اداریوں میں ان کی علمی اور فکری صلاحیتیں عام قاری کے سامنے آئیں، حالاں کہ علمی دنیا میں بہت پہلے سے ہی ان کی تحریروں کو قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور انھیں وقار واعتبار حاصل تھا۔

پیشِ نظر کتاب ’اسلام اور عصرِ جدید‘ اردو کی ادبی وفکری صحافت کا ایک اہم اور عمدہ نمونہ ہے جو مصنف کی شخصیت کو دیکھنے کا ایک زاویہ بھی دیتا ہے۔ یہ کتاب ان اداریوں کا مجموعہ ہے جو ’اسلام اور عصرِ جدید‘ کے علمی وفکری جریدے کے لیے لکھے گئے اور اہلِ علم و دانش سے خراجِ تحسین وصول کیا۔ علمی دنیا کے لیے نہ تو مصنف محتاجِ تعارف ہیں اور نہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز اور اس کے سہ ماہی جرائد ’اسلام اور عصر جدید‘ (اردو)، رسالہ ’جامعہ‘ (اردو)، ’اسلام اینڈ ماڈرن ایج‘ (انگریزی) اور ’اسلام اور آدھونک یگ‘ (ہندی) ہی کسی تعارف کے محتاج ہیں۔ مصنف کا شمار اگر جدید اسلامی فکر کے ان ممتاز اہلِ قلم میں ہے جنھوں نے مطالعاتِ اسلامی کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی گراں قدر کوششیں کی ہیں تو ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز ملک کے ان باوقار نامور اداروں میں ہے جنھوں نے اسلامیات میں تحقیق و تدوین کے کئی سنگِ میل رقم کیے ہیں۔ اسی طرح ’اسلام اور عصر جدید‘ کا شمار اسلامیات کے ان رسائل و جرائد میں ہوتا ہے جو علمی دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے رہے ہیں۔ قابلِ مبارکباد ہیں کتاب کے مصنف پروفیسر اختر الواسع اور مرتب احمد جاوید بھی جنھوں نے اس عہد ساز جریدے کے اداریوں کو اس کی فائلوں سے نکالا اور باوقار انداز میں مرتّب کر کے اہلِ علم ودانش کے ذوقِ مطالعہ کے لیے پیش کیا۔ احمد جاوید اپنے علمی وفکری میلانات کے سبب ادبی وعلمی دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنے ذہنِ رسا سے یہ ایک ایسا علمی کام کیا ہے جو موجودہ عہد کے قاری کی نگاہ سے اوجھل تھا۔ بلاشبہ وہ اور ان کی مرتّبہ کتاب ’اسلام اور عصرِ جدید‘ قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔ یہ کتاب اسلامیات کے طالبِ علموں، اساتذہ اور محققین کے لیے ناشرین کی جانب سے ایک بیش قیمت تحفہ ہے۔ کتاب کے مضامین نہ صرف معاصر واقعات و رجحانات اور عہدِ حاضر کی عہد ساز شخصیتوں کو احاطۂ تحریر میں لاتے ہیں اور ایک معتبر علمی ادارے کا موقف سامنے آتا ہے بلکہ یہ ایک طویل عرصے کے فکری تجربے اور سماجی مشاہدے کا نچوڑ ہیں۔

بہ غور دیکھیں تو یہ اداریے جو مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں، دراصل اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش ہیں کہ جدید دنیا کے مسائل اور چیلنجوں کے ساتھ اسلام کس طرح ہم آہنگ ہوسکتا ہے۔ مصنف کا بنیادی مطمحِ نظر ہے کہ اسلام محض ماضی کی روایت نہیں بلکہ ایک زندہ اور متحرک تہذیبی واخلاقی نظام ہے، جدید دنیا کے سیاسی، سماجی اور فکری مسائل کا حل اسلامی اقدار میں موجود ہے اور یہ کہ مسلمانوں کو جدید دور کے مسائل کا سامنا اجتہاد، مکالمے اور تعمیری رویّے کے ساتھ کرنا چاہیے۔ کتاب میں شامل اداریے اکیسویں صدی کی پہلی اور دوسری دہائی میں لکھے گئے ہیں، اس لیے ان میں معاصر سیاسی وسماجی حالات و واقعات کی جھلک بھی ملتی ہے اور تازہ افکار ونظریات کی آویزشیں بھی نظر آتی ہیں۔ قارئین مصنف کی آرا سے اختلاف کر سکتے ہیں لیکن ان کے اسلوبِ نگارش کے سحر سے خود کو دور نہیں رکھ سکتے۔

پروفیسر اختر الواسع نے کتاب کے ’پیش لفظ‘ میں اس کے مواد اور موضوعات پر اختصار مگر جامعیت کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ ان اداریوں کو جریدے کی فائل سے نکال کر کتابی صورت میں پیش کرنے کے جواز پر ان کا اصرار ہے اور وہ اس پر زور دیتے ہیں کہ انھوں نے ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ کے نصب العین اور اس کے بانیان کی فکر ودانش کو کتنی سنجیدگی سے آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ یہ اداریے اُس وقت لکھے گئے جب خلیج کی جنگ، نائن الیون، عراق وافغانستان، فلسطین اور گجرات کے اندوہناک واقعات رونما ہو رہے تھے، لہٰذا یہ تیزی سے بدلتی ہوئے دنیا کو کھلے ذہن سے دیکھنے کی کوششوں کا حصہ اور نت نئے سانحات کی سنگینی پر ایک علمی ادارے کا ردِّ عمل ہیں۔ یہ ایک پُر آشوب عہد کی علمی وفکری جہات کی روداد بھی ہیں اور تاریخ کے بعض اہم واقعات کو ازسرِنو دریافت کرنے کی کوشش بھی۔ جب کہ مقدمے میں مرتّبِ کتاب احمد جاوید نے اسلامک اسٹڈیز کی

> اطلاعاتی ٹیکنالوجی نے مواصلاتی انقلاب سے ایک ایسی دنیا کو ممکن بنایا جس میں انسانوں اور ان کے تمام تر معاملات کے درمیان کسی بھی فاصلے اور علاحدگی کا کوئی گزر نہیں رہ گیا۔...آج تک دنیا میں موجود مذاہب، تہذیبیں اور ثقافتیں ایک دوسرے سے الگ تھلگ جغرافیائی خطوں میں ظاہر ہوئیں اور پروان چڑھیں اور اسی لیے ان کے درمیان اجنبیت اور مغائرت کے فاصلے حائل رہے۔ آج یہ فاصلے عام اور کھلی اطلاعات و معلومات کے سامنے بے بس ہیں۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو اکیسویں صدی دنیا کے تمام مذاہب اور ان سے وابستہ تہذیبی روایات کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج لے کر رونما ہوئی ہے۔ یہ چیلنج ہے ایک دوسرے کو رد اور خارج کرنے کی جگہ ایک دوسرے کو قبول اور گوارا کرنے کا۔ مختلف تہذیبی روایتیں آج خواہ کتنی بھی کوشش کریں ایک دوسرے سے اثر پذیر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔

قارئین! اب ’ہماری زبان‘ کا مطالعہ انجمن ترقیِ اردو (ہند) کی ویب سائٹ www.atuh.org پر بھی کر سکتے ہیں جہاں اِسے مفت میں ڈاؤن لوڈ کرنے کی سہولت بھی موجود ہے۔

تاریخ، برِّصغیر میں اس کی صورتِ حال اوراس مضمون میں ہندستانی اسکالروں کی خدمات کے خاص خاص نکات اوراہم پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ مصنف کی شخصیت اوران کی خدمات پر فکرانگیز گفتگو کی ہے۔ دس صفحات کا یہ مختصر مقدمہ کوزے میں دریا سمونے کے محاورے کو عملی جامہ پہناتا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ اسلامک اسٹڈیز میں جن اداروں نے جدید علمی نقطۂ نظر کو فروغ دیا اور تکثیری ہندستانی ثقافت کو اس کے گراں قدر حصے کے طور پر آگے بڑھایا، ان میں ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کا حصہ جتنا اہم ہے، پروفیسر اختر الواسع کی خدمات اتنی ہی گراں قدر ہیں اور اس شعبے میں ان کا تعاون تاریخی بھی ہے اور توسیعی بھی جس کو آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ مرتب کا پروفیسر صاحب موصوف کی شخصیت، ان کے خاندانی پس منظر، تعلیم وتربیت اور ماحول کے تعلق سے یہ لکھنا کہ ان احوال و ظروف نے 'نہ صرف ان کی ذہنی، فکری اور لسانی نشوونما میں مدد کی، اظہار و بیان کا ادبی سلیقہ بھی دیا اور ایک کامیاب مدرس اور خطیب ہی نہیں بنایا، ان کے اندر ایک دانائے عصر مفکر بھی پیدا کیا، ان کی شخصیت کے مختلف رنگوں کو ایک ہی جملے میں آئینہ کردیتا ہے اور یہ مصنف کو دیکھنے کا ایک زاویہ بھی دیتا ہے'۔

400 صفحات کی یہ کتاب 'اسلام اور عصر جدید' کے 48 اداریوں پر مشتمل ہے اور یہ اداریے جن موضوعات کے گرد گھومتے ہیں، وہ 'اسلام اور تہذیبِ جدید'، 'ہندستان کے تناظر میں اسلام'، 'مذہب اور جدید فکری چیلنجز' اور 'تعلیم وفکری بیداری' ہیں۔ ان میں چند وفیات اور چند خصوصی شمارے یا مجموعہ مقالات کا دیباچہ ہیں جو طلبہ اور اسکالرز کے لیے خاص اہمیت رکھتے ہیں اور مصنف کا یہ ادعا بجا اور حق بجانب ہے کہ اگر ان کے 'یہ رشحاتِ قلم ہماری فہم وفراست کو واقعی تحریک دینے کے ساتھ ساتھ تاریخ کے ایک بڑے اہم اور نازک دور کے حساس امور کو چھوتے ہیں تو ان کو جریدے کی فائلوں سے نکال کر کتابی صورت دینا اور قارئین کی خدمت میں پیش کرنا بے سود اور لاحاصل نہیں ہے'۔

مصنف نے ان باتوں پر زور دیا ہے کہ (1) جدید تہذیب کے ساتھ اسلام کا تعلق تصادم کا نہیں بلکہ مکالمے کا ہے اور اختلاف کو تصادم میں بدلنے کے بجائے مکالمے کا ذریعہ بنایا جائے۔ (2) اسلام کو ہندستانی تہذیبی تنوع کے تناظر میں پیش کیا جائے۔ (3) اسلام انسان کو روحانی واخلاقی بنیاد فراہم کرتا ہے جب کہ جدید دنیا سائنسی ومادی ترقی کی نمائندہ ہے۔

مصنف کی رائے میں ہندستان ایک کثیر مذہبی اور تکثیری معاشرہ ہے جہاں مسلمانوں کو تعمیری کردار ادا کرنا چاہیے۔ بین المذاہب ہم آہنگی اور مشترکہ تہذیبی وراثت کو فروغ دینا ضروری ہے۔ وہ جدید فکری چیلنج اور جدید رجحانات جیسے سیکولرزم، مغربی مادیت اور تہذیبی تصادم کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ واضح کرتے ہیں کہ اسلام انسانی زندگی کے روحانی اور اخلاقی پہلو کو زندہ رکھنے کی قوت رکھتا ہے۔ وہ مسلمانوں کے مسائل کا بڑا سبب تعلیمی پسماندگی اور فکری جمود کو مانتے ہیں اور ان کو جدید تعلیم، تحقیق اور علمی مکالمے کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔

مصنف کے فکری رسائی اوران کے اسلوبِ نگارش کی خوبی دیکھیے، 'نئی صدی کی آمد' پر وہ لکھتے ہیں:

> ''ہم بالآخر ایک نئی صدی میں داخل ہوچکے ہیں۔ آج ایک بالکل نئی دنیا ہماری چشم وگوش، ہوش وحواس اور دل ودماغ کے سامنے پھیلتی جارہی ہے۔ یہ دنیا اور اس کا زمانہ انسانی تاریخ میں پائی جانے والی دنیا اور زمانوں سے یکسر مختلف ہے۔ بیسویں صدی کے نصف دوم کے دوران انسان کی تخلیقی ذہانت نے سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدانوں میں ایسی محیرالعقول پیش رفتیں کیں جن کی بنیاد پر ایک یکسر نئی انسانی تہذیب ومعاشرت کی تخلیق شروع ہوئی۔ اس ضمن میں سب سے بڑی انقلابی ایجاد تھی مصنوعی ذہانت جس نے کمپیوٹر کو وجود بخشا اور اس کے بعد اطلاعات ومواصلات کا وہ سیلاب جاری ہوا جس نے دیکھتے ہی دیکھتے ہماری اب تک کی معروف ومانوس دنیا کے رنگ وروپ اور فکر وخیال کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا۔ اطلاعاتی ٹیکنالوجی نے مواصلاتی انقلاب سے ایک ایسی دنیا کو ممکن بنایا جس میں انسانوں اور ان کے تمام تر معاملات کے درمیان کسی بھی فاصلے اور علاحدگی کا کوئی گزر نہیں رہ گیا۔... آج تک دنیا میں موجود مذاہب، تہذیبیں اور ثقافتیں ایک دوسرے سے الگ تھلگ جغرافیائی خطوں میں ظاہر ہوئیں اور پروان چڑھیں اور اسی لیے ان کے درمیان اجنبیت اور مغائرت کے فاصلے حائل رہے۔ آج یہ فاصلے عام اور کھلی اطلاعات ومعلومات کے سامنے بے بس ہیں۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو اکیسویں صدی دنیا کے تمام مذاہب اور ان سے وابستہ تہذیبی روایات کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج لے کر رونما ہوئی ہے۔ یہ چیلنج ہے ایک دوسرے کو رد اور خارج کرنے کی جگہ ایک دوسرے کو قبول اور گوارا کرنے کا۔ مختلف تہذیبی روایتیں آج خواہ کتنی بھی کوشش کریں ایک دوسرے سے اثر پذیر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔''

درج بالا تحریر کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جیسے یہ مضمون ابھی ابھی لکھا گیا ہے جب کہ یہ کوئی ربع صدی قبل اُس وقت کی تحریر ہے جب مواصلاتی انقلاب اور مصنوعی ذہانت کی صلاحیتیں ابھی اتنی واضح نہیں ہوئی تھیں اور دنیا نے وہ سیلاب بھی دیکھا تھا جو ساری سرحدیں بہالے گیا۔

سادہ اور رواں اسلوب، عام فہم زبان، دلائل اور تاریخی حوالوں کا ایسا استعمال کہ صدیوں کو جملوں میں سمیٹ دیں، فکر میں اعتدال اور نظریات میں توازن، شدت پسندی نہ مغرب زدگی اور مکالماتی انداز جو قاری کو سوچنے پر آمادہ کرے، ان اداریوں کی وہ خوبیاں ہیں جو کتاب کی افادیت کو صرف مذہبی یا علمی حلقوں تک محدود نہیں رہنے دیتیں بلکہ وسیع حلقوں میں قابلِ مطالعہ بناتی ہیں۔ کتاب کے مقدمے میں مرتب نے صحیح لکھا کہ اداریہ نگاری اگر آج کی دانش کو قارئین تک منتقل کرنے کی سائنس اور آرٹ ہے یا ان کو معاصر مباحث پر سوچنے کے لیے مجبور کرنے کا ہنر ہے تو یہ اداریے اس کا عمدہ نمونہ ہیں۔ الحاصل، یہ کتاب کئی حوالوں سے اہم ہے:

1- جدید اسلامی فکر کی نمائندہ تحریریں
2- ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل پر سنجیدہ گفتگو
3- مذہب اور جدیدیت کے تعلق پر متوازن نقطۂ نظر
4- اسلامیات کے شعبے (ڈسپلن) کی اہم شخصیات ورجحانات پر فکرانگیز تبصرے اور
5- اردو کی ادبی وفکری صحافت کی ایک اہم مثال

'اسلام اور عصرِ جدید' ایک ایسی کتاب ہے جو اسلام اور موجودہ دنیا کے تعلق کو سنجیدہ اور متوازن انداز میں سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ یہ اداریے نہ صرف معاصر مسائل کی تشریح کرتے ہیں بلکہ مسلمانوں کو ایک مثبت، تعمیری اور اعتدال پسند راستہ اختیار کرنے کی دعوتِ فکر بھی دیتے ہیں۔

Purasofi, Masjid Gulabchin, P.O Mubarakpur
Azamgarh-276404 (UP)
Mob. No.: 9936453914

انجمن ترقی اردو (ہند) کی چند مطبوعات

میرے مضامین (مجموعۂ مضامین ومقالات)	ڈاکٹر ماجد دیوبندی	300/-
نسخۂ حفیظ الدین احمد	اطہر فاروقی	1000/-
سرودِ عشق	شاہ رُخ جمال	200/-
گل دوگانہ	سیّد کاشف رضا	300/-
مشائخِ دہلی کی جامع تاریخ	پروفیسر شریف حسین قاسمی	700/-
مقالاتِ نظامی (پانچ جلدیں)	خلیق احمد نظامی	4500/-
نگینے لوگ (خاکوں کا مجموعہ)	معصوم مرادآبادی	250/-
ہمارا شہر اُس برس (گیتا نجلی شری)	ترجمہ: آفتاب احمد	700/-
میں میر میر کر اس کو بہت پکار رہا	سرور الہدیٰ	500/-
1857 کی اَن کہی حیرت انگیز داستانیں	شمس الاسلام	300/-
دیووں کا ظہور (الوک اگروال/ ینک اگروال)	مترجم: سیّد وجاہت مظہر	500/-
غزل اور فنِ غزل	ڈاکٹر نریش	200/-
فرہنگِ تلفظ: ایک تحقیقی وتنقیدی مطالعہ	سیّد رضوان علی ندوی	
	رؤف پاریکھ	250/-
مشاہیر ادب کے خطوط رشید حسن خاں کے نام	ابراہیم افسر	600/-
منیب الرحمٰن کی ایک صدی	بیدار بخت/ انور احمد	400/-
اردو املا اور حروفِ تہجی: لسانیاتی تناظر	رؤف پاریکھ	300/-
رموزِ اوقاف: کب، کہاں اور کیوں؟	ڈاکٹر شمس بدایونی	300/-
غروبِ شہر کا وقت	اُسامہ صدیق	900/-
کچھ اُداس نظمیں	ہربنس مکھیا	300/-
میانِ من وتو (تحقیقی وتنقیدی مضامین)	پروفیسر شاہد کمال	500/-
میرا جنون اردو (خطبات ومضامین)	طاہر محمود	700/-
میر کی خودنوشت سوانح (نثار احمد فاروقی)	صدف فاطمہ	400/-
کلّیاتِ خطباتِ شبلی	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	400/-
آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر بشیر بدر	500/-
اداریے (مشفق خواجہ)	محمد صابر	500/-
انور عظیم کی ادبی کائنات	فیضان الحق	700/-
بچوں کا گلدستہ (پانچ جلدیں)	غلام حیدر	2400/-
تحقیق وتوازن	ڈاکٹر نریش	250/-
تحقیقی مباحث	رؤف پاریکھ	300/-
چند فکری وتاریخی عنوانات	پروفیسر حکیم سیّد ظل الرحمٰن	400/-
ریت سمادھی (گیتا نجلی شری)	ترجمہ: آفتاب احمد	900/-
حکمِ سفر دیا تھا کیوں	شانتی ویرکول	200/-
عہدِ وسطیٰ کی ہندستانی تاریخ کے چند اہم پہلو	اقتدار عالم خاں	350/-
قدرت کا بدلا (موسم کا بدلاؤ)	سیّد ضیاء حیدر	600/-
کتابیاتِ حالی	ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد	300/-
یہ تو عشق کا ہے معاملہ	ڈاکٹر ہلال فرید	300/-
جب دیوں کے سر اُٹھے	ڈاکٹر ہلال فرید	360/-
سیر المنازل (مرزا سنگین بیگ)	شریف حسین قاسمی	600/-
محرابِ تمنا	فطرت انصاری	200/-
مکتوباتِ مولوی عبدالحق بنام مشاہیر...	میر حسین علی امام،	
	یاسمین سلطانہ فاروقی	700/-
لفظ (کلیاتِ زہرا نگاہ)	زہرا نگاہ	500/-
In This Live Desolation (Autobiography of Akhtarul Iman)	ترجمہ: بیدار بخت	500/-
سخنِ افتخار (کلیاتِ افتخار عارف)	افتخار عارف	1500/-
گواہی (شاعری)	گوہر رضا	500/-
میری زمین کی دھوپ (ہندی)	ونود کمار ترپاٹھی بشر	400/-
کھُلا دروازہ	ڈاکٹر نریش	250/-
ٹیپو سلطان کا خواب (گریش کرناڈ)	محبوب الرحمان فاروقی	300/-
اپنی دنیا آپ پیدا کر	غلام حیدر	900/-

منظؔر بھوپالی کی غزلوں کا شعری مزاج

عارف عزیز

بوے گل کی طرح اُردو دنیا میں پھیلی ہوئی شہرت کے مالک منظؔر بھوپالی کی شاعری، اُس کی اُٹھان اور مقبولیت ہمارے سامنے ہے، اُن کا زیرو سے سفر شروع کر کے بامِ عروج پر پہنچنا بھی کسی سے پوشیدہ نہیں، آج منظؔر ہندستان میں نہیں دور دراز کی اُردو بستیوں میں بھی کتنے مقبول ہیں، اِس کا ہم شب وروز کے اُن کے مشاعروں کے سفر اور حضر سے اندازہ کر سکتے ہیں۔

منظؔر بھوپالی کو 40-35 سال پہلے مشاعرے پڑھتے دیکھا اور سنا تھا، آج بھی وہ اِس مرحلۂ شوق سے گزر رہے ہیں تو اُن کی ترقیات کے اِس سفر پر خوشی ہوتی ہے کہ اُن کے ذریعے دنیا جہان میں بھوپال کی نمائندگی ہو رہی ہے۔ وطن سے یہ اُن کی محبت ہی تو ہے کہ اُنھوں نے اپنے نام کا جزو بھوپال کو بنا رکھا ہے۔ منظؔر کے کتنے ہی ہم سفر اِس عرصے میں اپنا سفر تمام کر چکے ہیں لیکن قابلِ رشک حد تک اُن کی پیش رفت جاری ہے۔

فی الوقت میرے پیشِ نظر منظؔر کا چھٹا مجموعۂ کلام 'تعویذ' ہے۔ 112 صفحات اور 56 غزلوں کا یہ مجموعہ ایسے اشعار سے مزین ہے جس پر ہر شاعر فخر وامتنان کا احساس کر سکتا ہے۔ 34 سال پہلے منظؔر کے ایک شعر کو میں نے روزنامہ 'افکار' کے اداریے میں شامل کیا تھا اور قارئین کی طرف سے اِس شعر پر خوب داد ملی تھی، شعر تھا:

تازہ ہوا کی چاہ میں اے ساکنانِ شہر
اِتنے نہ در بناؤ کہ دیوار گر پڑے

آج اِس نوع کے اشعار سے اُن کے مجموعۂ کلام بھرے ہوئے ہیں، چند اشعار کی تب وتاب کا آپ بھی اندازہ لگائیں:

ہم احترامِ محبت میں سر جھکاتے ہیں
غلط نکال نہ مفہوم خاکساری کا

بسا دی ہے دھوپ کی بستی یہ کس ستم گر نے
یہاں تو پیڑ تھے، میدان کر دیا کس نے

خموشی کو کسی کی بزدلی کا نام مت دیجے
جو چپ رہتے ہیں، دل میں وہ بڑے طوفان رکھتے ہیں

یہ مت سمجھیے آپ کی باری نہ آئے گی
اُس نے بہانے کھینچ رکھے ہیں کمان میں

اشعار کے مانند ہے، چہروں کی اُداسی
گھر گھر میں یہاں میر کے دیوان بہت ہیں

یہ حوصلہ ہو تو میدان میں اُتریے گا
بغیر سر دیے سرداریاں نہیں چلتیں

منظؔر بھوپالی طویل مدت سے شعر کہہ رہے ہیں، اِس مشقِ سخن سے اُنھیں زبان و بیان اور تجربات ومحسوسات کے اظہار پر گہرا عبور حاصل ہو گیا ہے، شاعری میں وہ حضرت رضؔا رامپوری کے شاگرد ضرور ہیں، لیکن اپنے اُستاد کی راہ سے اُنھوں نے انحراف کیا جو اُن کے لیے نیک فال ثابت ہوا اور منظؔر کو نئے محسوسات اور مطالبات سے ہم آہنگ ہونے میں مدد ملی، اُن میں قدیم روایات کے احترام اور اُن سے استفادہ کے ساتھ تیز رفتارِ زمانہ کے قدم بقدم چلنے نیز عصری تقاضوں کو پورا کرنے کی سکت وہمت پیدا ہو گئی، یہی وجہ ہے کہ اُن کے یہاں ہر تبدیلی کی دھمک سنائی دیتی ہے۔ منظؔر نے یوں تو نظمیں بھی لکھی ہیں، لیکن بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر ہیں، اُن کے یہاں دیگر اصناف کی حیثیت ذائقے کی تبدیلی سے زیادہ نہیں ہے۔

غزل جو اُردو شاعری کی رائج الوقت صنف ہے، حالاں کہ ایک زمانے میں اُس کی گردن زدنی کو روا سمجھا گیا، اِسے نیم وحشی صنفِ سخن سے تعبیر کیا گیا لیکن غزل کے پرستاروں نے اُس کا دامن نہیں چھوڑا بلکہ وقت کے ساتھ اُس کی مقبولیت نئے جہان سر کرتی رہی، غزل میں بیان خواہ عشق کا ہو، انقلاب کا ہو یا ذات کا، غزل کلاسکی ہو، ترقی پسندی کے خمیر سے اُٹھی ہو یا جدید لب ولہجہ کا جامہ پہنے ہو، غزل اوّل وآخر غزل ہوتی ہے۔ اگر اپنے فن اور روایت کے ساتھ کہی گئی ہو تو کوزہ میں سمندر کو سمونے جیسا نازک فن بن جاتی ہے۔

منظؔر نے بھی اِس پوری روایت کو سامنے رکھ کر غزل کہی ہے اور اسلاف کی خوشہ چینی کے بجائے اپنی الگ راہ نکالی ہے، اگرچہ اب تک اُن کا اپنا رنگ گہرا نہیں ہوا ہے لیکن وہ اُسی سمت گامزن ہیں جس کی منزل انفرادیت ہوتی ہے۔ منظؔر کے درجِ ذیل اشعار پڑھیں، یہ اُن کی شاعری کے مزاج اور ہیئت کو شاید مزید واضح کر سکیں:

نئے سخن، نئے امکان لے کے آئے ہیں
ہم اپنے آپ کی پہچان لے کے آئے ہیں

کوئی بچنے کا نہیں، سب کا پتہ جانتی ہے
کس طرف آگ لگانی ہے، ہوا جانتی ہے

محبتوں کا یہ اچھا صلہ دیا اُس نے
ہماری آنکھ کو دریا بنا دیا اُس نے

توجہ دشمنوں پر ہے ضروری
مگر اپنوں سے بھی ہوشیار رہنا

ہوئیں جو بارشیں، مٹی کی سوندھی خوشبو کی
پرانی سوئی ساری قربتیں جاگیں

منظؔر ایک رجائی شاعر ہیں، اُمید وبیم اُن کی شاعری کی اساس ہے، جو اشعار غمِ انسان سے عبارت ہیں، وہ بھی مایوسی کی فضا پیدا نہیں کرتے، وہ اِس کے قائل ہیں:

کوئی بھی قیامت ہو، وہ گزر ہی جاتی ہے
دوستو کوئی صدمہ دیر تک نہیں رہتا

اُن کی شاعری میں آج کے مسائل کی بازگشت، وقت وحالات کی دھڑکن سبھی کچھ جمع ہو گئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ صرف کاغذ پر نہیں عوامی مشاعروں میں بھی سرخرو رہتے ہیں، کیوں کہ ہر مزاج کے قاری اور سامع کو اُس کی پسند کا مواد مل جاتا ہے، اُن کے موضوعات بھی بندھے ٹکے نہیں، اُن میں جو تنوع ہے وہ شعری لب ولہجہ میں ایک اثر پیدا کر دیتا ہے، اِسی کے نمائندہ چند شعر اور دیکھیں:

دشمنی اُس کی طبیعت میں رچی ہے منظؔر
کوئی چنگاری جہاں دیکھی ہوا دی اُس نے

اُتر رہے ہیں پرندے تمھاری یادوں کے
اُجاڑ دل کی حویلی سنورنے والی ہے

یہ کیا ہوا کہ اچانک بھڑک گئے شعلے
یہ تیز خون کا دوران کر دیا کس نے

ہمیشہ کام آنا دوسروں کے
شجر ہو تم تو سایہ دار رہنا

سچائی یہ ہے کہ منظؔر کے مجموعے کے نام کی طرح اُن کی شاعری بھی مثبت جذبات ومحسوسات کی آئینہ دار ہے، اُن کے یہاں جذبے یا تجربے کے اظہار کے لیے تصنع، بناوٹ یا بوجھل آرائشگی کا اہتمام نہیں ہے۔ ایک اور بات جو متوجہ کرتی ہے وہ فکر وخیال کو الفاظ کے انتخاب کے لیے آزاد چھوڑ دینا ہے، اِسی لیے اُن کے اشعار الفاظ، مشاہدے یا تجربے کا حصّہ بن کر سامنے آتے ہیں۔ اُن کے لفظی پیکر دل کش وپُر اثر ہیں تاہم الفاظ کو اظہار اور تجربے کے بہاؤ پر چھوڑ دینے سے کہیں ایسے الفاظ بھی استعمال ہو گئے ہیں جو شعری تقاضے کا ساتھ نہیں دیتے:

کہاں ہے آگ کا سامان، اُس کی کٹیا میں
غریب سرد ہواؤں کو لحاف کرتا ہے

پھر چراغوں نے بھی جواب دیا
ہوا جب ہاتھا پائی کرنے لگی

ملیں تو کیسے ملیں دل سے دل نہیں ملتا
ہر ایک رشتہ ٹھکانے لگا دیا اُس نے

منظؔر کے اوّلیں مجموعۂ کلام 'یہ صدی ہماری ہے' میں ادب کے پارکھی مخمور سعیدی کا اُن کے بارے میں یہ تجزیہ برحق ہے کہ ''منظؔر بھوپالی دیکھنے والی نظر اور محسوس کرنے والا دل رکھتے ہیں اور اپنے محسوسات اور مشاہدات کے اظہار کا سلیقہ بھی اُن کے پاس ہے، ایک اچھے شاعر کا اثاثہ یہی چیزیں ہوا کرتی ہیں''۔

20-گھاٹی بھڑبھونجہ روڈ، تلیا، بھوپال-462001
E-mail:arifazizbpl@rediffmail.com
Mob.09425673760

اردو دُنیا

اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن صوبہ دہلی کی جنرل باڈی کی میٹنگ

نئی دہلی (9 مارچ)۔ اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن صوبہ دہلی کی جنرل باڈی کی میٹنگ آئیڈیل یونانی ہیلتھ کیئر دہلی میں منعقد کی گئی۔ تنظیم کے تمام اراکین نے اہم فیصلوں، مالیاتی رپورٹ، سالانہ کارکردگی اور انتظامی مسائل پر بات چیت کی، اس سلسلے میں نئے ایجنڈے طے کیے گئے، اہم پالیسیوں کو منظوری ملی اور مسائل کے حل کے لیے مشاورت کی گئی۔ فیصلہ سازی پر اتفاقِ رائے کیا گیا۔ مستقبل کے منصوبے، آنے والے وقت کے لیے اہداف کی رپورٹ اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے قومی صدر ڈاکٹر سیّد احمد خاں کے نمائندہ عارف ندیم کو سونپی گئی۔ ڈاکٹر سیّد احمد خاں نے اپنے پیغام میں کہا کہ چھے ماہ قبل بعض وجوہ کی بنا پر جمیل انجم دہلوی کی جگہ ڈاکٹر مفتی جاوید انور دہلوی کو صدر اور ماسٹر مقصود احمد کو جنرل سکریٹری نامزد کیا گیا تھا۔ مجھے امید ہے نئے انتخاب اور تشکیلِ نو کے مرحلے کو شفافیت کے ساتھ پورا کیا جائے گا۔ انھوں نے اپنی دیگر تنظیمی مصروفیات کے باعث جنرل باڈی کی میٹنگ میں عدمِ شرکت کے لیے معذرت کی۔ جنرل سکریٹری ماسٹر مقصود احمد نے تجاویز پیش کرتے ہوئے کہا کہ جس طرح ماضی میں ڈائرکٹوریٹ آف ایجوکیشن میں شریف الحسن نقوی اور دہلی سرکار میں آر پی سنگھ نوڈل آفیسر تھے، دہلی سرکار سے اپیل ہے کہ انھیں اسی طرح بھرا جائے۔ مدارس، مساجد، اسکول، مکتب اور گلیوں کے نام اردو میں لکھنا شروع کیا جائے، 2020 کی نئی ایجوکیشن پالیسی آئی ہے اس میں سرکار نے یہ طے کیا ہے کہ بچوں کو ان کی مادری زبان میں تعلیم دی جائے، کوشش کی جائے کہ تمام پرنسپل صاحبان سے مل کر کم از کم آٹھویں تک مادری زبان میں تمام مضامین پڑھائے جائیں۔ سائن بورڈ کے خرچ کے بارے میں پوچھے گئے سوال کے جواب میں ماسٹر مقصود احمد نے کہا کہ ہماری تنظیم کا ہر ممبر 200 روپے مہینہ دے گا جس سے ہم کم از کم ہر مہینے کسی دو جگہ کے نام اردو میں تنظیم کی طرف سے بورڈ لگوائیں گے یا پھر چسپاں کروائیں گے۔ سوشل ورکر اقبال ملک نے بتایا کہ گذشتہ 25 برسوں سے اردو اخبار خرید کر پڑھتا ہوں، تنظیم سے جڑ کر میں اردو کے فروغ کے لیے کام کروں گا۔ ڈاکٹر نجم السحر نے کہا کہ ہم اردو میں بورڈ لگانے کا سلسلہ گلی مدرسہ شاہ عبدالعزیز دہلوی سے شروع کریں گے جو کلاں محل دہلی میں واقع ہے۔ تنظیم کے کنوینر وسیم احمد صدیقی نے بتایا کہ شیلا دکشت سرکار کے زمانے میں یہ سلسلہ تھا کہ اگر بچے اردو، سنسکرت یا پنجابی جس زبان کے لیے اپنے اسکولوں میں درخواست دیتے تھے اُس زبان کا ٹیچر انھیں مہیا کرا دیا جاتا تھا، اس سلسلے کو دوبارہ شروع کرنے کی ضرورت ہے۔ اشفاق حسین نغمی نے کہا کہ اردو کے فروغ کے لیے محلوں میں میٹنگ کی جائے، نکڑ ناٹک کیے جائیں جس سے یقیناً فروغِ اردو میں مدد ملے گی۔ (سیاسی تقدیر۔ دہلی)

مدنی اردو ہائی اسکول کے طالبِ علم ساحل منصوری کی کامیابی

جوگیشوری (8 مارچ)۔ مدنی اردو ہائی اسکول جوگیشوری کے بائیس سالہ طالبِ علم ساحل منصوری نے اپنی مستقل مزاجی، انتھک محنت اور خود اعتمادی سے کمپنی سکریٹری (سی ایس) کے مشکل ترین امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ فی الحال وہ پووائی کی آئی آر بی انفراسٹرکچر ڈیولپرس لمیٹڈ نامی کمپنی میں سی ایس کے عہدے پر فائز ہونے کے لیے ضروری 21 مہینوں کی آرٹیکل شپ (ٹریننگ) کر رہے ہیں۔ سبھاش نگر، جوگیشوری (مشرق) کے ساحل منصوری نے 2019 میں مدنی اردو ہائی اسکول سے 78 فیصد مارکس سے ایس ایس سی امتحان پاس کر کے گوریگاؤں کے وویک کالج میں کامرس فیکلٹی میں داخلہ لیا تھا۔ 2021 میں 82 فیصد نمبروں سے بارہویں جماعت میں کامیابی حاصل کرنے کے ساتھ کمپنی سکریٹری کی پڑھائی کے لیے انٹرنس ٹسٹ دیا۔ انٹرنس ٹسٹ میں پاس ہو کر اپنی کامرس کی پڑھائی کے علاوہ دن رات محنت کر کے کمپنی سکریٹری کی پڑھائی بھی جاری رکھی۔ 2022 میں سی ایس ایگزیکٹو لیول کا مشکل ترین امتحان دیا اور پہلی ہی بار میں کامیاب ہوئے۔ 2024 میں بی کام کا فائنل ایئر کلیئر کیا۔ دسمبر 2025 میں تیسری مرتبہ سی ایس کا فائنل امتحان دیا۔ مسلسل محنت، نظم و ضبط اور خود پر یقین کے ساتھ فائنل امتحان میں شرکت کی۔ اس بار ان کی محنت رنگ لائی۔ 6 فروری 2026 کو جاری ہونے والے رزلٹ میں کامیابی کی اطلاع ملی۔

اردو میڈیم سے پڑھائی کر کے کمپنی سکریٹری بننے کا سفر کیسا رہا؟ اس سوال کے جواب میں ساحل نے کہا کہ ''مجھے فخر ہے کہ میں نے اردو میڈیم سے پڑھائی کی ہے۔ مجھے کبھی احساس نہیں ہوا کہ اردو میڈیم سے پڑھائی کرنے کی وجہ سے کسی طرح کی دقت آئی ہو''۔

(انقلاب۔ ممبئی)

مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی کی جانب سے کتابوں کی اشاعت کے لیے مالی امداد کا اعلان

ممبئی (پریس ریلیز)۔ مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی نے اردو زبان و ادب کی مختلف اصناف میں تخلیقی خدمات انجام دینے والے قلم کاروں کی حوصلہ افزائی کے پیشِ نظر ان کی کتابوں کی اشاعت کے لیے مالی امداد کا اعلان کیا ہے۔ اکادمی کی جانب سے جاری کردہ پریس ریلیز کے مطابق کلینڈر سال 2023 اور 2024 کے دوران اکادمی کو موصول ہونے والے مسودات کی ماہرینِ ادب کے ذریعے جانچ کے بعد مختلف ادبی زمروں میں متعدد مسودات کو مالی اعانت کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ اکادمی کے مطابق اس اسکیم کا بنیادی مقصد اردو زبان و ادب کے فروغ کے ساتھ ساتھ معیاری تخلیقات کی اشاعت کو ممکن بنانا اور نئے و باصلاحیت قلم کاروں کی حوصلہ افزائی کرنا ہے۔ اس سلسلے میں منتخب کیے گئے مسودات کو اکادمی کے قواعد و ضوابط کے مطابق جزوی مالی اعانت فراہم کی گئی تاکہ یہ علمی و ادبی سرمایہ کتابی شکل میں قارئین تک پہنچ سکے۔ اکادمی کے کارگزار صدر حسین اختر نے امید ظاہر کی ہے کہ اس طرح کی اسکیموں کے ذریعے اردو زبان و ادب کے تخلیقی سرمایے میں اضافہ ہوگا اور اہلِ قلم کو اپنی تحقیقی و ادبی کاوشوں کو منظرِ عام پر لانے کے بہتر مواقع میسر آئیں گے۔ اکادمی نے تمام منتخب مصنّفین کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے یقین دلایا ہے کہ اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے اس طرح کی سرگرمیاں آئندہ بھی جاری رکھی جائیں گی۔

2023 میں جن مسودوں کو مالی اعانت دی گئی اُن کی تفصیل:

تحقیق و تنقید: تفہیم کے دائرے میں (فردوس انجم)، اردو شاعری میں اخلاقی عناصر (ڈاکٹر تحسین کوثر)، زیرِ نظر (ڈاکٹر محمد اسداللہ)، برمحل اشعار کے تناظر میں سرقہ اور توارد (خلیق الزماں نصرت)۔ ادبِ اطفال: صبح نکلتا وہ سورج (علیم طاہر)، گلستاں (انصاری محمد جاوید)، مرچ شہزاری (انصاری مختار احمد)، تاروں بھرا آسمان (شاہ تاج خاں)، افسانچۂ اطفال (سراج فاروقی)، مضامین و ترجمہ: وہ پھلوں کی ملکہ (ڈاکٹر سنمتر نوگھرے)، ضیائے قلم (ضیاء الرحمٰن قریشی)، مضامینِ محمدی (میرزا کرعلی)۔ سوانح، سفرنامہ، سائنس: فکشن پر گفتگو (طاہر انجم صدیقی)، شعری کتابیات مالیگاؤں (ڈاکٹر آصف فیضی)، گلہائے ادب اپنے رنگ و بو میں (ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان)، نقشِ تحریر (وجاہت عبدالستار)، بت کہی (اشتیاق سعید)۔ شاعری: رنگِ الفت (منظور فیض سبحانی)، یادِ رفتگاں (سیّد ہاشمی علی)، بساطِ سخن (عرفان قنوجی)، فسونِ شب (قدرت ناظم)، بچوں کا دل کھولا پوری (عبدالرزاق)، نیرنگِ نظر (راعنا حیدری)، دانائے سخن (عبدالرحمٰن سراج)۔ طنز و مزاح: پڑھتے پڑھتے مسکرانا (شکیل اعجاز)۔

2024 میں جن مسودوں کو مالی اعانت دی گئی ہے ان کی تفصیل:

تحقیق و تنقید: نور الحسنین کی ڈراما نگاری کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ (شیخ اظہر بشیر)، حسین الحق ناولوں کے آئینے میں (رضوانہ رہبر)۔ ادبِ اطفال: آسیب کی گرفت میں (شعیب محمد محسن)، معاشرتی کہانیاں (تبسم نازنین)۔ مضامین ترجمہ: کاوشیں (ڈاکٹر شیخ عمران)، عالمی لوک کہانیاں (عرفان عالم منشی)، سعادت حسن منٹو کی کہانیوں میں سماجی شعور (ملک اکبر)۔ سوانح، سفرنامہ، سائنس: پراگندہ کیمیات (ڈاکٹر رفیع الدین ناصر)، انڈاسیل سے بیوی کے نام خطوط (ڈاکٹر شیخ عبدالواحد)۔ شاعری: معراج رباعی (ابو سامہ ہارون رشید)، مہکتے لفظ (اظہار عاطف)، مدحت کے پھول (انیس عبدالرحمٰن پٹیل)، سجن کی خوشبو (حکم چند کوٹھاری)، گلہائے سخن (وجاہت حسین خاں)، تشنق (شیخ مشتاق)۔ طنز و مزاح: آدھی دنیا کا مکمل آدمی (اظہر فاضل)۔ افسانہ، ناول: ستم ہائے روزگار) (سہیم الدین صدیقی)، سن سکو گے (شاہ نواز اختر انصاری)، رات (رضوانہ نقی)۔

(آج کی آواز۔ اورنگ آباد)

مصلح الدین کو پی ایچ. ڈی کی ڈگری تفویض

نئی دہلی (یکم مارچ)۔ دہلی یونیورسٹی کا 102 واں سالانہ کانووکیشن 28 فروری 2026 کو صبح 7.30 بجے ملٹی پرپز ہال، دہلی یونیورسٹی اسپورٹس اسٹیڈیم کمپلیکس میں منعقد کیا گیا۔ اس کانووکیشن میں مصلح الدین بن عطاء الرحمان کو پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی، جنھوں نے پروفیسر شمیم احمد، سینٹ اسٹیفن کالج (دہلی یونیورسٹی) کی زیرِ نگرانی '1970 کے بعد غزل میں لسانی تجربے' کے عنوان پر اپنا تحقیق کا کام مکمل کیا ہے۔ 25 فروری کو آن لائن وائیوا منعقد کیا گیا جس کے ممتحن پروفیسر آفتاب احمد آفاقی بنارس ہندو یونیورسٹی تھے۔ اس پروگرام میں شعبۂ اردو کی جانب سے خصوصی طور پر صدر شعبۂ اردو پروفیسر ابوبکر عباد نے شرکت کی۔ اس کے علاوہ شعبۂ اردو سے کثیر تعداد میں اساتذہ و طلبہ شریک ہوئے۔ واضح ہو کہ دہلی یونیورسٹی کے 102 ویں کانووکیشن میں 1.2 لاکھ سے زیادہ طلبہ کو ڈگریاں دی گئیں، جس کے مہمانِ خصوصی سی. پی. رادھا کرشنن تھے۔ جہاں نائب صدر سی. پی. رادھا کرشنن نے فارغ التحصیل طلبہ سے کہا کہ وہ ملک کے مستقبل کے معمار کے طور پر خدمات انجام دیں اور ہندستان کی ترقی کو ہندستانی حقائق سے جڑنے اور عالمی سطح پر مسابقتی بنانے میں کلیدی کردار ادا کریں۔ انھوں نے اپنے خطاب کے دوران کہا کہ ''ڈگری محض سرٹیفکیٹ ہے، لیکن حقیقی تعلیم انسانیت، کردار اور ذمہ داری سے جھلکتی ہے۔'' نائب صدر جمہوریہ نے مزید کہا کہ تعلیم زندگی کا آخری مرحلہ نہیں ہے بلکہ ایک مسلسل عمل ہے اور اس بات پر زور دیا کہ علم حاصل کرنا ایک مسلسل جستجو ہے۔

اردو ہندی ڈکشنری

انجمن ترقی اردو (ہند)

قیمت: 300 روپے

عالمی یومِ خواتین کے موقعے پر

ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی میں مذاکرہ

نئی دہلی (8 مارچ)۔ ساہتیہ اکادمی کی جانب سے عالمی یومِ خواتین کے موقعے پر 'لوک ادب میں نسوانی کردار نگاری' کے موضوع پر ایک روزہ مذاکرہ منعقد کیا گیا۔ پروگرام میں ملک کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے لوک ادب کے ماہرین اور محققین نے شرکت کی اور لوک روایتوں میں خواتین کے کردار پر گفتگو کی۔ پروگرام کے آغاز میں اکیڈمی کی پروگرام افسر مرگینی گپتا نے استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ لوک ادب کسی بھی سماج کے جذبات اور تجربات کی عکاسی کرتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ لوک گیتوں، کہانیوں اور روایات میں عورت مختلف کرداروں میں نظر آتی ہے۔ اس موقعے پر لوک ادب کی ماہر ماولی کوشل آن لائن شریک ہوئیں۔ انھوں نے نسوانی قوت کے حوالے سے شیو اور پاروتی کے اساطیری بیانیے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ان روایات میں پاروتی کو طاقت کا سرچشمہ قرار دیا گیا ہے۔ پہلے پروگرام میں لوک ادیبہ پریتی آریہ نے کماؤں کے لوک ادب پر گفتگو کی۔ ایسٹر سیموئیل نے انڈمان کی لوک روایات اور خواتین کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا ذکر کیا جب کہ سواتی آنند نے چھتیس گڑھ کے لوک ادب پر روشنی ڈالی۔ پروگرام کی صدارت سگندھا ناگر ترویدی نے کی۔ انھوں نے اپنی گفتگو میں گوجر سماج کے لوک گیتوں پر مبنی کتاب 'گجری لوک گیت' کا ذکر کیا اور آشا دیوی گجری کا حوالہ دیا۔ پروگرام کے اختتام پر اما کاچی مراک نے گارو زبان میں لوک گیت پیش کیا۔ دوسرے سیشن میں جورام آنیا تانا نے نشی قبیلے کے لوک ادب پر گفتگو کی اور اروناچل پردیش کی قبائلی روایات کا ذکر کیا۔ اس کے بعد ماہیشوری ویرسنگ گاویت نے آدی واسی لوک ادب میں خواتین کے مقام پر اظہارِ خیال کیا۔ پروگرام کی صدارت وندنا ٹیٹے نے کی۔ انھوں نے کہا کہ لوک ادب نسل در نسل منتقل ہونے والی تہذیبی روایت کا حصہ ہے۔ تیسرے سیشن کا آغاز ایسٹر سیموئیل کے پیش کردہ نیکوباری لوک گیت سے ہوا۔ گارو ادب کی محققہ باربرا نے گارو خواتین کی روایات پر روشنی ڈالی جب کہ بینی سمی یاتھن نے ناگالینڈ کے قبائلی لوک ادب اور اس میں خواتین کے کردار کا ذکر کیا۔ پروگرام کی صدارت لوک ادیبہ گیتا نے کی۔ انھوں نے بنجارہ خواتین کے لوک ادب اور ثقافتی روایات پر گفتگو کی۔ پروگرام کے اختتام پر اکیڈمی کی معاون مدیر لکشمی کماری بھگت نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا جب کہ نظامت مرگینی گپتا نے کی۔ (انقلاب۔ دہلی)

اردو اکیڈمی کے دفتر کی توسیع کے لیے

حکومتِ تمل ناڈو کا حکم نامہ جاری

چینئی (9 مارچ)۔ تمل ناڈو اسٹیٹ اردو اکیڈمی کے وائس چیئرمین ڈاکٹر محمد نعیم الرحمٰن کی اطلاع کے مطابق حکومتِ تمل ناڈو نے اردو اکیڈمی کے دفتر کی عمارت کی توسیع کے لیے گیارہ لاکھ پندرہ ہزار روپے کی رقم جاری کرنے کا حکم صادر کیا ہے۔ اس رقم سے دفتر میں ایک اضافی کمرہ اور ایک واش روم کی تعمیر کی جائے گی۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ شعبۂ اردو، نیو کالج چینئی اور تمل ناڈو اسٹیٹ اردو اکیڈمی کے درمیان حال ہی میں ایک اہم مفاہمتی یادداشت (MOU) طے پائی ہے، جس کے تحت علمی و ادبی تعاون کو فروغ دینے کے لیے مشترکہ سرگرمیوں کا آغاز ہوا ہے۔ اسی پس منظر میں گذشتہ دنوں شعبۂ اردو نیو کالج چینئی کے طلبہ و اساتذہ نے اردو اکیڈمی کا دورہ کیا تھا۔ اس موقعے پر وائس چیئرمین ڈاکٹر محمد نعیم الرحمٰن نے انھیں وہ مقام بھی دکھایا تھا جہاں اب دفتر کی توسیع کا منصوبہ عملی شکل اختیار کرنے جا رہا ہے۔ ڈاکٹر محمد نعیم الرحمٰن کی یہ قابلِ قدر کاوش اس بات کی غماز ہے کہ وہ اردو زبان و ادب کی ترقی اور اردو اکیڈمی کی فعالیت کو مزید موثر بنانے کے لیے خلوص و دل جمعی کے ساتھ کوشاں ہیں۔ ان کی یہ جدوجہد یقیناً اردو کے فروغ کی تاریخ میں ایک مثبت قدم کے طور پر یاد رکھی جائے گی۔ اس خوش آئند موقعے پر طلبہ و اساتذہ شعبۂ اردو نیو کالج چینئی کی جانب سے ڈاکٹر محمد نعیم الرحمٰن کو دلی مبارک باد اور نیک تمنائیں پیش کی گئی ہیں۔ مبارک باد پیش کرنے والوں میں ڈاکٹر طیب خرادی نے اس اہم پیش رفت پر مسرت کا اظہار کیا۔ اس موقعے پر پروفیسر سیّد سجاد حسین اور ڈاکٹر حیات افتخار نے بھی ڈاکٹر محمد نعیم الرحمٰن کو دلی مبارک باد پیش کی اور اس اقدام کو اردو زبان و ادب کے فروغ کی جانب ایک خوش آئند پیش رفت قرار دیا۔
(نظام آباد مورننگ ٹائمز)

ادارہ ادبِ اسلامی میرا روڈ کی جانب سے شاندار مشاعرہ

میرا روڈ، ممبئی (29 جنوری)۔ 26 جنوری 2026 کو شام سات بجے ادارۂ ادبِ اسلامی ہند کی میرا روڈ یونٹ نے ایک شاندار مشاعرے کا انعقاد کیا۔ یہ مشاعرہ اسلامی سنٹر میرا روڈ میں منعقد ہوا، جو ادبی و ثقافتی سرگرمیوں کا ایک اہم مرکز ہے۔ مشاعرے کی صدارت کُل ہند صدر ادارہ ادبِ اسلامی ہند ڈاکٹر سلیم خاں نے کی۔ نظامت یوسف دیوان نے بہ حسن وخوبی انجام دی۔ یوسف دیوان مشاعرے میں اپنی بہترین پیش کش اور منفرد انداز کے لیے مشہور ہیں۔ مشاعرے میں ڈاکٹر چشتی محمد طارق نے بطورِ مہمانِ خصوصی شرکت کی۔ پروگرام کا آغاز حسبِ روایت حمد و نعتِ پاک سے ہوا، جس نے مشاعرے میں روحانی ماحول قائم کیا۔ مشاعرے کے ناظم محمد طاہر شاہ (صدر ادارہ ادبِ اسلامی میرا روڈ) نے تمام شعرا و شرکا کا پُرتپاک استقبال کیا اور تمام شعرا کی خدمت میں تحائف پیش کیے۔ مشاعرے میں کہنہ مشق استاد شعرا کے ساتھ ساتھ نوجوان شعرا کو بھی موقع دیا گیا تاکہ نئی نسل کی آبیاری ہو سکے۔ شعرا میں یوسف رانا، رشید بشر، اسلم ثانی، ملک عظیم، مستحسن عزم، یوسف دیوان، محشر فیض آبادی، سعید خاں، حسنین ساحل جیسے کہنہ مشق شعرا نے اپنا کلام پیش کیا۔ تمام شعرا کے کلام کو پسند کیا گیا۔ مشاعرے میں کثیر تعداد میں مقامی اور دیگر علاقوں سے سامعین کے علاوہ ادبی حلقوں کے لوگ شامل تھے۔ یہ تعداد ادبی محفلوں کی مقبولیت اور بڑھتی دلچسپی کو ظاہر کرتی ہے۔ آخر میں صدر مشاعرہ ڈاکٹر سلیم خاں نے اپنے اختتامی خطاب میں تمام شعرا کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ معیاری کلام اور بامقصد شاعری معاشرے کی ایک اہم ضرورت ہے۔ مشاعرہ تفریحِ طبع سے آگے اصلاحِ فکر و جذبات کا ذریعہ بھی ہے۔ ناظمِ مشاعرہ محمد طاہر شاہ نے تمام مہمانان اور شعرا کا شکریہ ادا کیا۔ (سیاسی تقدیر۔ دہلی)

ادب نواز گروپ کی جانب سے شعری نشست کا انعقاد

مالیر کوٹلہ (31 جنوری)۔ ادب نواز گروپ کی جانب سے ایک آن لائن عالمی مشاعرہ (شعری نشست) منعقد کیا گیا۔ اس کی صدارت جاوید رحمانی (ای ای او اور اڈیٹر اِن چیف، جرنلزم ٹوڈے گروپ نیز گروپ ایڈیٹر روزنامہ 'سائبان'، دہلی) نے کی، جب کہ مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر اشفاق شاہین (گجرات، پاکستان) شریک ہوئے۔ اس کے علاوہ بطورِ مہمان سیّد ریاض رحیم (ممبئی)، لکچرر بلبیر کورا رائیکوٹی (صدر، وشو پنجابی سبھا) اور ہرجیت سوہی (مشہور لوک گیت کار اور گلوکار) نے شرکت کی۔

مشاعرے کا آغاز ہرجیت سوہی نے حمدیہ کلام پیش کر کے کیا جس پر سامعین نے بھرپور داد دی۔ اس کے بعد محمد عباس دھالیوال نے اپنی غزل پیش کی۔ بعد ازاں بلبیر رائیکوٹی نے پنجابی زبان میں دو نظمیں پیش کیں جنھیں حاضرین نے بے حد پسند کیا۔ اس کے بعد ہرجیت سوہی کی جانب سے ایک گیت پیش کیا گیا۔ ممبئی سے شریک ہونے والے سینئر شاعر سیّد ریاض رحیم نے بھی اپنے کلام سے حاضرین سے خوب داد وصول کی۔ اس موقعے پر ان کے اس شعر کو خاص طور پر بے حد سراہا گیا:

رفتید ولے نہ از دلِ ما

ڈاکٹر جمال اویسی

دربھنگہ۔ متھلا یونیورسٹی کے ایک اے آر ایم کالج کے شعبۂ اُردو کے استاد معروف شاعر و ادیب ڈاکٹر جمال اویسی کا 7 اور 8 مارچ 2026 کی درمیانی شب میں انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر تقریباً 64 برس تھی۔ وہ گذشتہ کچھ عرصے سے سخت بیمار تھے۔ پس ماندگان میں ایک بیٹا اور بیٹی ہیں۔ 8 مارچ کو ہی خانقاہ سمرقندیہ کے احاطے میں نمازِ جنازہ ادا کی گئی۔ نمازِ جنازہ مولانا شمس اللہ جان بابو حضور نے پڑھائی، جس میں بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔ نمازِ جنازہ میں شرکت اور اظہارِ تعزیت کرنے والوں میں پروفیسر عبدالمنان طرزی، پروفیسر شاکر خلیق، پروفیسر مشتاق احمد، پروفیسر آفتاب اشرف، پروفیسر افتخار احمد، ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، ڈاکٹر عالمگیر شبنم، ڈاکٹر محمد بدرالدین، ڈاکٹر فیاض وجیہ، ڈاکٹر عبدالودود قاسمی، انور آفاقی، ڈاکٹر نجیب اختر، ڈاکٹر جسیم الدین، ڈاکٹر ایوب راعین، ڈاکٹر مبین صدیقی، ڈاکٹر افلاک منظر، ڈاکٹر رضی حیدر، ڈاکٹر عبدالرافع، پروفیسر انسان علی، ایڈووکیٹ عرفان پیدل، منظر صدیقی، پروفیسر رحمت اللہ، ڈاکٹر عطا عابدی، خالد عبادی، شارق ظفر، نسیم احمد رفعت مکی، ڈاکٹر منصور خوشتر، ڈاکٹر فردوس علی، نظر عالم، ریاض خان قادری، اعجاز احمد رومی، ڈاکٹر امتیاز احمد وغیرہ شامل تھے۔ محلّہ رحم خاں کے قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ قابلِ ذکر ہے کہ ڈاکٹر جمال اویسی معروف ترقی پسند شاعر اویس احمد دوراں کے فرزند تھے، جب کہ وہ خود نئی نسل کے نمائندہ شاعر سمجھے جاتے تھے اور شاعری میں جدید تر رجحان کے علم بردار تھے۔ قدیم و جدید شعر و ادب اور تنقید پر ان کی گہری نظر تھی۔ اردو زبان و ادب کے ماہرین کے درمیان اپنی منفرد شناخت رکھتے تھے۔ ان کی غزلوں اور نظموں کے کئی مجموعوں کے علاوہ نثری کتابیں بھی منظرِ عام پر آ چکی ہیں جن میں 'رکا ہوا سیل'، 'نظم نظم'، 'شور کے درمیاں'، 'مصباح'، 'انا پذیر'، 'نقش گریز'، 'عشق کے سوا'، 'نقد و نفی'، 'مظہر امام: نئے منظر میں' اور 'اویس احمد دوراں: ایک بازدید' وغیرہ شامل ہیں۔

ان کے انتقال پر ادبی تنظیم بزمِ رہبر نے تعزیت کا اظہار کرتے ہوئے ان کے انتقال کو اردو ادب کے لیے بڑا نقصان قرار دیا ہے۔ تعزیت کرنے والوں میں ڈاکٹر منور راہی، انجینئر عمر فاروق، نیاز احمد، نسیم اختر برداہوی، رہبر چندن پٹوی، مشتاق اقبال، نظام بخش، جنید عالم آروی، منظر ریونڈھوی، احسان، مکرم پوری، مسرور پنڈولوی، ڈاکٹر مقصود رفعت، ظفر انور شکرپوروی، ڈاکٹر احمد معراج، ثناء اللہ ثنا دوگھروی وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ ان کے انتقال سے پورے دربھنگہ کی ادبی فضا سوگوار ہے۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبرِ جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

مکاں سے لامکاں ہوتے ہوئے بھی
کہاں ہم ہیں، کہاں ہوتے ہوئے بھی

مشاعرے کے مہمانِ خصوصی اشفاق شاہین نے پنجابی اور اردو دونوں زبانوں میں اپنی غزلیں پیش کیں۔ پروگرام کے صدر جاوید رحمانی نے ادب نواز گروپ پنجاب کی جانب سے منعقدہ اس پروگرام کی دل کھول کر تعریف کی۔ اس موقعے پر انھوں نے اپنے مرحوم والد عتیق مظفر پوری کی ایک غزل سنا کر سامعین کو مسحور کر دیا۔ اپنے صدارتی خطاب میں انھوں نے محمد عباس دھالیوال کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ عباس دھالیوال ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہونے کے ساتھ ساتھ باصلاحیت اور ملنسار انسان ہیں۔ وہ جہاں مختلف اصناف میں لکھتے ہیں وہیں اس نوعیت کے پروگراموں کا انعقاد کر کے نہ صرف زبانوں بلکہ لوگوں کے باہمی تعلقات کو مضبوط بنانے کی کامیاب کوشش کر رہے ہیں۔
(سچ کی آواز۔ دہلی)

'تماشا' اور 'رُکی ہوئی زندگی' منشایاد اور حمید شاہد کی افسانوی زبان کا تقابل

(بقیہ صفحہ 8 سے آگے)

پورا کمرا... پرفیومز سے مہکنے لگتا... آئینہ وہ منظر دکھانے لگتا تھا جس میں وہ نہیں ہوتی تھی۔ یہ 'آئینہ' والا الٹا عکس خوب ہے مگر دو تین ایسی تصویریں لگاتار آجائیں تو افسانہ ایک 'سجاوٹی شور' میں بدل جاتا ہے۔ اس کے برعکس 'تماشا' میں ''بستی کے مینار ساتھ ساتھ چلتے رہتے ہیں'' ایک اکہرا منظر اور بے اثر علامت اور حرکت مل کر 'کہانی' کو زبردستی آگے دھکیلتی ہیں، زبان کو نہیں، زبان کچی اور مصنوعی ہونے کی وجہ سے جامد ہی رہتی ہے۔

محمد حمید شاہد کی زبان افسانے کے لیے غیر ضروری اور مصنوعی طور پر افسانوی، بے محابا صناعی سے لدی اور نحوی تزئین میں حد سے بڑھی ہوئی ہے۔ یہ بناوٹ افسانوی بدن پر چڑھ کر اسے بے جان کر دیتی ہے۔ افعال کی رفتار کم، اسمیت کا جال زیادہ۔ اس کے مقابل منشا یاد کا 'تماشا' سادہ، محاورہ آشنا، اور حسی، ایسا کہ جہاں منظر خود معنی دیتا محسوس ہوتا ہے۔

حمید شاہد کے افسانے 'رُکی ہوئی زندگی' میں نحوی تزئین اور اسمیت کی زیادتی جملے کو اتنا بھر دیتی ہے کہ افعال کی سانس اکھڑتی محسوس ہوتی ہے۔ ذرا دیکھیے، ایک ہی سانس میں کیفیت اور تشبیہ کی بوچھار کے بعد پورا پیرا تفسیر بن جاتا ہے، ''جتنی دیر وہ... چہرے کو ڈھنگ سے دیکھنے کے جتن کرتا رہا'' اور فوراً ہی ''وقت کی سفا کی نے سب کچھ مٹا کر ایک نئی تحریر لکھ دی تھی''۔ یہ 'تحریر' اور 'اِضمحلال' جیسی مجرد لغت منظر کو نظریاتی پردے سے ڈھانپ دیتی ہے۔ قاری کردار کے بدن سے نہیں اصطلاحات سے مخاطب ہوتا ہے۔

اسی افسانے میں 'عادت، معمول، دائرہ' جیسے بڑے اسم مسلسل جملے کی گرہ بن جاتے ہیں ''عادت کی ڈوری میں بندھا بدن دُکھتا تھا... دونوں میں ہمت نہ تھی کہ... دائرے کو توڑ ڈالیں''۔ زبان یہاں 'قول' بن کر اوپر چڑھتی ہے۔ فعل، لمس اور منظر پیچھے ہٹتے ہیں۔ قاری ایک دفعہ پھر بطور ناظر کم اور بطور نقاد زیادہ متحرک رہنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ افسانوی سرشاری کم ہوجاتی ہے، تشریحی دباؤ بڑھ جاتا ہے۔

لفظی زیب و زینت کا ایک اور طریقِ کار 'فہرست نگاری' ہے جو 'اِمپورٹیڈ باڈی لوشنز ... ویکسنگ ... پفنگ ... بلش آن ... کاسمیٹکس' اور پھر 'ٹشو پیپرز کا ڈھیر' جیسے الفاظ کی مصنوعی فہرستیں، اگر سین کے اندر گھل مل جائیں، تو چلو کچھ گزارا ہوجائے مگر جب یہ بناوٹیں خود منظر بن جائیں تو یہاں بھی دھیان جملہ اشیا کی طرف جاتا ہے، کردار کی طرف نہیں۔ جس سے معنی اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے بجائے سجاوٹ کے سہارے لنگڑاتا رہتا ہے۔

اسی پیرا میں ایک بے تاثر اور حد سے بڑھی ہوئی آرائشی ترکیب ہے دیکھیے ۔۔۔''آئینہ وہ منظر دکھانے لگتا تھا جس میں وہ نہیں ہوتی تھی''۔ بظاہر خیال دلکش لگتا ہے، مگر مسلسل ایسے خود کو تخلیقی دکھانے والے نثری جملے شاعری کی صنعت تضاد کے سرقے صاف پکڑے جاتے ہیں۔ ایسے تو مصرعوں کا بھی مذاق اڑایا گیا ہے۔ مثلاً

میں اکیلا جا رہا تھا ، ساتھ میرے ہجوم تھا
باغ میں تھی چاندنی شاید اندھیری رات تھی

حمید شاہد کے ہاں ایسے باہر تخلیقی مگر حقیقت میں کامک نثری کرتب جہاں جہاں بھی آتے ہیں بناوٹ کو افسانہ بنانے کی کوشش بے نقاب ہوجاتی ہے۔ ہر سطر 'نثری نظم' کی طرف جھک جاتی ہے۔ کرداروں کی کشمکش، جو ڈرامائی تقابل سے اُبھرنی چاہیے تھی، آئینہ، خوشبو اور سطحی چمک کے ہنگامے میں دب کر رہ جاتی دکھائی دیتی ہے۔

اسی کے مقابل منشا یاد 'تماشا' میں زبان کو جسم اور حرکت کے تابع رکھتے ہیں۔ وہیں مجمع، چادر، بانسری، ڈگڈگی سب کم لفظوں میں منظر کی مشینری بنا دیتے ہیں۔ جب بڑے کی زبان سے یہ سطور نکلتی ہیں کہ ''ابھی تک کسی بالغ مرد یا عورت نے... ادھر کا رخ نہیں کیا''، تو سماجی نوکیلا پن بغیر کسی خطبے کے ذہن میں چبھتا ہے ایک فقرہ اور پوری اخلاقی صورتِ حال روشن ہوجاتی ہے۔ اور حرکت سے جنم لینے والی علامت بھی بالکل واضح نظر آتی ہے۔ اور یہ ترکیب حمید شاہد کی طرح 'تماشا' میں باہر سے لادی نہیں جاتی، خود منظر کے قلب سے اٹھتی ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں بستی کا کیریکچر کھلتا ہے اور جمورا پھسلتی ہوئی سوجھ بوجھ کے ساتھ کہتا ہے۔ ''میرا خیال ہے ہم بونوں کی بستی میں آگئے ہیں'' اور فوراً سردار کی تحکمانہ کٹیلی زبان اس احساس کو حقیقت میں بدل دیتی ہے۔ چھوٹے، کٹ دار فقرے علامت، تمثیل اور طنز ایک دھڑکتے سین میں بیٹھ جاتے ہیں۔

اب پھر 'رُکی ہوئی زندگی' کی طرف پلٹ کر دیکھیں۔ یہاں شعری رومانویت اکثر حد سے زیادہ تراشی ہوئی مسیں جما لیتی ہے، ''اسے تو خود آغاز چاہیے تھا۔ بھیگا ہوا آغاز''۔ یہ ترکیب بظاہر سمعی سطح پر قابلِ قبول نظر آتی ہے، مگر 'آغاز، انجام' کے مبہم رومان میں واقعاتی قوت تحلیل ہوجاتی ہے اور منظر آگے بڑھنے کے بجائے لہجے کی خود نمائی میں ٹھیر جاتا ہے۔

اسی پیرا میں ایک اور مثال شدت کی نمائش دیکھیے ''کچوکوں سے بیدار... وہ لسلسا کیڑا... پھل سنکھی ... لمبی چونچ کے ٹھونگوں سے جگاتی ہے''۔ یہ تشبیہ ایک لمحے کو چونکا دیتی ہے مگر انسانی کشمکش کو حیوانی، حشریاتی کراہت میں بدل دیتی ہے۔ قاری ہمدردی کی بجائے نفرتی حِس میں اٹک جاتا ہے اور یہی وہ کرختگی ہے جو افسانے کی ہضم پذیری کم کرتی ہے۔

اس کے برعکس 'تماشا' میں بھیانک خواب کی زبان میں بھی بدن اور فضا کا ربط قائم رہتا ہے ''کتے رو رہے ہیں اور اوس سے بوجھل ہوا اداس اداس پھر رہی ہے''، یہاں کسی نظریہ بند اصطلاح کا شور نہیں۔ ہوا، اوس، اداسی تین لفظ اور سکوت کے اندر خوف کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ شاعرانہ پن ہے، مگر خود منظر کے تابع۔

'رُکی ہوئی زندگی' کا ایک مستقل مسئلہ قول اور قاعدے کی جانب لپک ہے جس سے زبان مکتبی نحو میں بدل جاتی ہے۔ ''مرد اپنی عورت سے چھپ چھپا کر باہر جو کچھ کرتا ہے، عورت اسے جان لیا کرتی ہے''، یہ جملے ایک سماجی قاعدہ سناتے ہیں مگر افسانوی ڈراما قاعدے کی تشریح کے نیچے دب جاتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ بیانیہ خطبے کے قریب اور کہانی سے دور۔

اسی دَوران 'تماشا' میں آوازیں، اشیا اور بدن افعال سے ہم آہنگ رہتے ہیں ''بڑے... بانسری اور ڈگڈگی نکال کر بجانے لگتا ہے... دیکھتے ہی دیکھتے بہت سے بچے... جمع ہوجاتے ہیں''۔ کوئی لفاظی نہیں چند افعال، اور پورا منظر۔ پھر تماشائی بچے سردار کے اشارے پر کہاں اور کیسے بیٹھتے ہیں۔ ''چند بچے... چار پائیاں اور مونڈھے اٹھائے آتے ہیں'' یہ سب کوریوگرافی کی طرح کھلتا ہے، پڑھنے والا دیکھتا ہے، سمجھ لیتا ہے، بغیر کسی توضیح کے۔

'رُکی ہوئی زندگی' میں ایک اور عطائی پن کیفیت کا مبالغہ ہے۔ ''سکوت تنا ہوا تھا۔ گاڑھا، گھمبیر اور گھمس والا سکوت''، متوازی تکرار نہ سمعی لذت دیتی ہے اور نہ کیفیاتی۔ وہی بے ہنگم مبالغہ جو معنی کی بجائے نغمگی کی نمائش بن جاتا ہے۔ قاری کے لیے خاموشی محسوس کرنے کی بجائے خاموشی کی آرائش دیکھنے کا معمولی تجربہ رہ جاتا ہے۔

اس کے مقابل 'تماشا' میں چھوٹے مگر وزنی فقرے علامت کو سادہ رکھتے ہیں مگر اثر شدید ہوتا ہے ''یہ کوئی اسرار ہے پتر... ہم ہر روز لوگوں سے مخول کرتے ہیں آج ہمارے ساتھ مخول ہو رہا ہے''۔ یہاں تمثیل، طنز اور اخلاقی اُلٹ پھیر دو فقروں میں بند ہے۔ کوئی اضافی خطبہ نہیں، منظر اور آواز ہی دلیل ہیں۔

'رُکی ہوئی زندگی' کی فہرست نگاری جب گھریلو صفائی تک پھیلتی ہے تو ''گھر کو... چمکایا لشکایا جاتا... دیواروں پر چھینٹے ڈھونڈ ڈھونڈ کر صاف کیے جاتے'' اور نثر محض لفظوں کی قلابازیوں کا مظاہرہ بن جاتی ہے۔ افسانہ بناوٹی اشیا کے رقص میں ہے، کردار پس منظر میں۔ اگر ایسی تفصیل درمیان میں ایک جھٹکے سے قطع ہو کر کسی غیر متوقع فعل میں ڈھلے تو قوت بن سکتی ہے مگر یہاں وہی جعلی لفظوں کا ڈھیر لگتا رہتا ہے۔

اس کے عین مقابل "تماشا" میں سماجی طنز ایک فیصلہ کن فقرے سے نشتر بن جاتا ہے: ''ہم ایسے لوگوں کو... بستی میں زیادہ دیر رکنے کی اجازت نہیں دیتے'' جیسا فقرہ ایک مکمل منظر نامہ بن جاتا ہے جیسے پورا سماجی نظم، طاقت کی ساخت اور اخلاقی محرومی ایک سطری مکالمے میں اُتر آئے ہوں۔ زبان معنی پر سوار نہیں ہوتی بلکہ معنی کو چلنے کے قابل بناتی ہے۔

نتیجہ صاف ہے، 'رُکی ہوئی زندگی' میں زبان اکثر 'زبان بر زبان' ہو کر افسانے کے بدن سے باہر نکل جاتی ہے۔ اسمیت، فہرستوں کی افراط، مبالغۂ کیفیت، تشبیہاتِ غلیظہ اور رومانِ مبہم جملوں کو ایسا بے ہنگم شور بنا دیتے ہیں کہ منظر کی حرکت دبتی ہے یہی کرختگی اور ثقالت افسانے کی 'ہضم پذیری' کم کر دیتی ہے۔

اس کے خلاف 'تماشا' میں زبان حرکت، جگہ اور بدن کے تابع رہتی ہے چند افعال اور مختصر مکالمے پورے طرزِ احساس کو اٹھا لیتے ہیں اور علامت منظر کے اندر سے جنم لیتی ہے- اسی لیے قاری بطور ناظر آگے بڑھتا ہے اور معنی خود اس کے اندر جا بیٹھتا ہے۔

محمد حمید شاہد کے 'رُکی ہوئی زندگی' میں جملہ بندی کا مصنوعی پن، تخلیقی اسلوب اپنانے کی ناکام کوشش کا بوجھ اور فہرست نگاری کی افراط افسانوی بدن پر غالب آجاتے ہیں اور اس کے مقابل منشا یاد کے 'تماشا' میں مختصر افعال، محاورہ، منظر نامہ اور صوتی کفایت کہانی کو منظر کی سطح پر سانس دیتے ہیں۔ آغاز میں میں، 'رُکی ہوئی زندگی' کے چند جملے جن میں وہی بنیادی علتیں صاف دکھائی دیتی ہیں جیسے کہ ''وہ چہرہ سامنے تھا مگر معنی اوٹ میں تھے، آنکھیں تھک کر پلکوں کی چھاؤں میں جا بیٹھی تھیں اور کاسۂ سر میں ایک مدھم سی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی''۔ یہاں دیکھیے کہ فعل کی حرکت سے زیادہ بناوٹی کیفیت کی بوچھار ہے جو کہ معنی اوٹ میں اور گھنٹی مسلسل، جیسی مجہول جملوں کو خطیبانہ اور نثری نظم کے قریب لے جاتی ہیں، افسانوی وقوعہ پیچھے ہٹتا ہے۔ اسی افسانے میں ذرا آگے ایک فقرہ اور پڑھیے ''ہاتھ میکانکی انداز میں چلتے رہے، اشیا اپنی جگہ سنبھالتی رہیں، مگر اندر کہیں ایک پتھر ڈوبارہ گیا''۔ یہاں بھی تین مجرد سطحیں ایک سانس میں چڑھا دی گئیں، میکانکی ہاتھ، خودکار اشیا اور اندر کا پتھر۔

یہ اسمیت افعال کی جگہ گھیر لیتی ہے اور منظر کی موجودگی کمزور پڑ جاتی ہے۔ پھر وہی فہرست کی ریل پیل جس میں افسانہ شے نامہ بننے لگتا ہے- محمد حمید شاہد، 'رُکی ہوئی زندگی' ''ڈریسر پر بکھرا ہوا مسکارا، لپ لائنر، ٹونر، کاٹن بال، نیل پالش ریموور اور ایک طرف نیم کھلا باکس جس میں سونے کے رنگ کا جھمکا الٹا پڑا تھا'' یہ جزئیات اگر کسی فیصلہ کن فعل کی طرف پلٹیں تو منظر سنبھل جائے مگر جب فہرست خود مرکز بن جائے تو قاری کردار کی دھڑکن بھول کر چیزوں کی ترتیب گننے لگتا ہے۔ اسی کے ساتھ مبالغۂ کیفیت کی جھلک دکھانے کو ایک اور سطر دیکھیے ... ''سکوت ایسا تھا جیسے نمی میں ڈوبا ہوا غلاف، جو سانس سے لپٹ لپٹ کر سانس ہی چرا لے'' یہ بظاہر شاعرانہ تشبیہ ہے مگر منظر کی حقیقی خاموشی کو بے تحاشہ شور میں بدل دیتی ہے۔ قاری خاموشی کو محسوس کرنے کی بجائے اس کی زبردستی کی سجاوٹ دیکھتا رہ جاتا ہے اور جب رومانِ مبہم راہ پاتا ہے تو افسانہ مزید لیرکس کی سمت ڈھلتا ہے، جیسے کہ ''اسے لفظ نہیں ایک نمی درکار تھی آغاز کی نمی، جس میں بدن اپنا پرانا غنچہ پھر سے آزما لے'' یہاں تجربے کی تہ ڈرامائی استعارات کی بہتات میں بہہ جاتی ہے۔ نتیجہ یہ کہ کہانی کا وقت آگے نہیں کھسکتا، لہجے کا بے معنی غبار چھا جاتا ہے۔ اسی افسانے میں ایک جملہ ایسا بھی ہے جو عطائی پن کی سب پرتیں ایک ساتھ کھول دیتا ہے۔۔۔''اندر گھومتی ہوئی مشین کے پیچ کسنے کی آواز آتی

رہی اور باہر ہر شے جیسے اپنی جگہ سے ذرا ہٹ گئی‘‘... یہاں اندر کی مشین اور باہر کی شے دو سطحی تمثیلیں ہیں مگر فعل واقعہ غائب ہے، افسانہ ایک استعاری غبار میں تحلیل ہو گیا۔ اب اسی کے عین مقابل منشایاد کی زبان دیکھیے جو کم لفظوں میں پورا پورا منظر بناتی ہے۔ منشایاد، ’تماشا‘ کا جملہ دیکھیے۔۔۔ ’’بڑے نے بانسری لبوں سے لگائی تو ہوا تھوڑی دیر کو رکی ہوئی سی معلوم ہوئی‘‘ دو لفظی حرکتیں، لبوں سے لگائی اور‘‘ ہوا رُکی، اور پورا منظر سانس لینے لگا۔ اسی افسانے میں ایک اور چھوٹا مگر کاری جملہ ہے۔۔۔ ’’لڑکے نے ڈگڈگی کی تھاپ تیز کی تو بچے قریب سرک آئے‘‘ یہاں زبان کے ہاں نہ تحریر ہے نہ معنی کا وعظ بس فعل ہے اور اس فعل سے پیدا ہوتی حرکت ہے۔ منظر کے اندر علامت خود جنم لیتی ہے کہ ’تماشا‘ کیسے کھینچتا ہے۔ پھر سماجی طنز کے لیے ایک سطر کافی ہے۔

’’سردار نے کہا، تماشا دکھاؤ، باتیں سب سے بعد میں‘‘، یہ وہی دنیا ہے جس میں طاقت کی زبان مختصر مگر آمرانہ ہے، قاری سماجیات پر علیحدہ وعظ سنے بغیر اقتدار کے لہجے کو سن لیتا ہے۔ اب میں ’رُکی ہوئی زندگی‘ کی لفظیات کی ایک اور پرت کھولوں، متوازی تراکیب اور ربطی کڑیاں جملے کو اتنا بے اثر بناتی ہیں کہ معنی کے بجائے ’بناوٹ‘ دکھائی دینے لگتی ہے۔ مثال دیکھیے۔۔۔ ’’وہ لوٹنے کو لوٹا ضرور، مگر لوٹا نہیں، وہ ٹھہرا ضرور، مگر ٹھہرا نہیں، جیسے وقت نے اس کی کلائی تھام کر آگے کو دھکیل دیا ہو‘‘۔ گویا ایک بے معنی تکرار سے کہانی کے عیب چھپانے کی کوشش کی گئی ہو، مگر یہ تکرار جب ایک ہی پیرے میں جمع ہو تو افسانوی حرکت کھوکھلے لفظوں کے دائرے میں بند ہو جاتی ہے۔ پھر اس پر خود کلامی کی دبیز لہر چڑھتی ہے۔۔۔ ’’میں نے سوچا، سوچ کو روک لوں، مگر سوچ کو روکا نہیں جاتا‘‘۔ یہ باطن کی نگرانی اگر کسی ٹھوس فعل کی طرف جھکے تو فائدہ دیتی ہے ورنہ یہ قول اندر قول ہو کر کہانی کی ڈور ڈھیلی کر دیتی ہے۔ اس کے بالمقابل منشایاد کی کفایت ملاحظہ ہو... ’’جمورا بولا، تم کہو تو ابھی کرتب بدل دوں... یہ ایک سطر کردار، رشتہ، خوف، اور ہنر چاروں کو بیک وقت حاضر کر دیتا ہے۔ نہ کوئی مبہم رومان، نہ فہرست، نہ خطابت محض ایک زندہ، جیتا جاگتا منظر۔ منشایاد، کے ’تماشا‘ کی ایک اور سطر میں منظر کی پختگی اور اخلاقی انعکاس ایک ساتھ بند ہیں... ’’تالیوں کی گونج مدھم ہوئی تو چیخ سنائی دی اور لوگ ہنس پڑے‘‘۔ یہاں زبان تماشا بینی کا پورا فلسفہ ایک جملے میں بند کر دیتی ہے اور ’ہنس پڑے‘ میں اخلاقی دیوالیہ پن باقاعدہ گونجتا ہے۔ اور اب واپس کرافٹ کی اصل جڑ وہ تمثیلیں ہیں جو انسانی بدن کی نفسیات کی بجائے حشری و میکانکی علامتوں سے چلائی جاتی ہیں۔۔۔ حمید شاہد کا ایک اور زبردستی کا کرافٹ دیکھیے۔۔۔ ’’وہ یوں تھی جیسے کسی بند صندوق میں قید جلتی بجھتی بتی، جو مدھم پیلے چھینٹوں سے اندھیرے کو چھیڑتی رہتی ہے‘‘۔ یہ سطر ایسی ہے جیسے کسی بے سری بانسری سے کسی راگ کے الاپ کی کوشش کی گئی ہو، اسی لیے کردار کی انسانی پیچیدگی ایک ’صندوق، بتی‘ کی تمثیل میں منتشر نظر جاتی ہے۔ افسانہ ’مثالی لائٹنگ ڈیزائن‘ بن جاتا ہے، ڈرامائی مکالمہ نہیں۔ اسی افسانے کی ایک اور نمائشی کڑی، ’’گھر کی دیواروں پر نمی کی لکیر ایسے چڑھی تھی جیسے کسی نے پرانے نقش پر نیا پانی پھیر دیا ہو‘‘ اچھا فقرہ ہے مگر اس کے ساتھ اگر کوئی فیصلہ کن حرکت نہ آئے تو یہ محض بے معنی تراکیب کا مرقع رہ جاتا ہے۔ منشا یاد اس کے برخلاف حرکت سے معنی نکلواتے ہیں۔ منشا کے ’تماشا‘ کی ایک اور لائن دیکھیے۔۔۔ ’’اس نے بانسری روکی تو بچے اور پاس آ گئے، ڈگڈگی تھمی تو ایک لڑکے نے کہا، اچھا تھا، پھر بجاؤ‘‘۔ یہاں منظر بدلتا ہے اور ساتھ ہی قاری کی توجہ بھی دیکھنے، سننے کے تجربے پر قائم رہتی ہے۔ کوئی اصطلاحی چھتری سر پر نہیں رکھی جاتی۔ اب آخری بار ’رُکی ہوئی زندگی‘ کے ایک اور جملے سے وہی کمزوری واضح کروں جسے میں سخت، غیر ہضم پذیر کہتا ہوں۔ محمد حمید شاہد، ’رُکی ہوئی زندگی‘ میں ہی رقم طراز ہیں:

’’دل نے چاہا کہ سب الٹ دے، لفظوں کی ترتیب بھی، سانس کی آمد و رفت بھی، مگر وہی ہوا کہ سب وہیں رہ گیا جہاں تھا‘‘ یہ خود کلامی، یہ سب الٹ دینے کا ارادہ، اگر کسی فعل میں ظاہر ہوتا تو افسانوی کشش پیدا ہوتی مگر جب سب کچھ ’دل نے چاہا‘ کے حلقے میں گول گول گھومتا رہے تو کہانی حرکت کے بجائے دائرہ بن جاتی ہے۔ اس کے جواب میں مَیں منشایاد کی ایک سطر مزید رکھتا ہوں جو کہانی کو ایک ہی پل میں آگے دھکیل دیتی ہے۔ ’تماشا‘ ہی کی سطر ہے ’’بڑے نے کہا، یہ بستی نہیں ہمارے لیے، پھر بھی وہیں ٹھہرے رہے‘‘۔ یہ دوہرا پن فیصلہ اور ٹھیراؤ کہانی کے بدن میں حقیقی تناؤ پیدا کرتا ہے، لیکن کسی خطیب کی طرح کوئی فصیح بیان نہیں بلکہ صرف افسانہ پن۔

ان دو افسانوں کے تفصیلی تقابل کے بعد آیئے محمد حمید شاہد اور منشا یاد کے دیگر افسانوں کے اسلوبی و نحوی سانچوں کا سرسری تقابل کرتے ہیں۔

محمد حمید شاہد کے افسانوں میں زبان کی وہی کرختگی کا بوجھل پن، فہرستوں کی افراط، خطابت کی جھالر اور نحوی گرہوں کی سکّت جو ایک نثری کانٹینٹ میں نمودار ہوتی ہیں اور ان کے دوسرے افسانوں میں بھی بار ہا اپنی ہی صورت دہراتی ہیں۔ گویا اسلوب کی کمزور رگ مسلسل دھڑکتی رہتی ہے۔ اس کے برعکس منشایاد کے ہاں ’تماشا‘ کی جو افسانوی نزاکت، محاورے کی مہک، فعل کی روانی اور منظر کی حسّیت دکھائی دیتی ہے، وہ ان کے دیگر نثری مواد میں بھی یکساں رچاؤ کے ساتھ پھیلتی ہے۔

ابھی میں محمد حمید شاہد کے افسانوں پر مرکوز رہتے ہوئے چند نمایاں پیٹرنز کی نشان دہی بھی کرتا چلوں تو ان کی غیر تخلیقیت کچھ مزید واضح ہو جائے گی۔ سب سے پہلی چیز فہرست نویسی اور تصویری دھینگا مشتی ہے جو جملوں کی لسی بناتی چلی جاتی ہے اور قصہ پن کو پیچھے دھکیل دیتی ہے۔ مری کے پس منظر میں لکھے گئے افسانے ’برف کا گھونسلا‘ میں بیانیہ ایک ہی سانس میں منظر کی اشیا گنوا کر ایک مجسماتی جھلک پیدا کرتا ہے اور فعل کی حرکت کم کر دیتا ہے۔ یہی دیکھیے، ’’حدِ نظر تک دودھ جیسی سفیدی تھی، مکانوں کی ڈھلوان چھتوں پر، آنگنوں میں، پتھروں اور گھاس پر، درختوں کی ننگی شاخوں پر‘‘ اس فہرستی تکنیک سے نہ منظر چمکتا ہے نہ تحریر میں زندگی آتی ہے مگر فعل کی رفتار ضرور مدھم ہو جاتی ہے۔ قاری کا ذہن فہرست کے خانوں میں الجھتا ہے، اور پلاٹ کی کشش ثقل کچھ لمحوں کے لیے کمزور پڑتی ہے۔ یہی جگہ ہے جہاں زبان کی خوب صورتی کہانی کے دھاگے کو چھپکلی کی طرح چمک دار مگر سرد بناتے ہوئے ایک طرح کی کرختگی میں بدل جاتی ہے۔

دوسرا پیٹرن تالیفی خطابت اور ’مقولہ سازی‘ ہے جس میں جملہ اپنے آپ پر جھک کر اپنے کو درست کرنے کی کوشش کرتا ہے اور مواد کی سمت نصیحتی ہو جاتی ہے۔ ’تماشا‘ کی ابتدا ہی اس رجحان کا نمائندہ جملہ ہے... ’’عورت اور خوشبو ہمیشہ سے میری کمزوری رہے ہیں‘‘ (عورت، خوشبو اور نماز کی پسندیدگی کی حدیث مبارک سے مستعار لیا ہوا جملہ) اور فوراً خود اصلاحی کا لاحقہ بھی سامنے آتا ہے کہ شاید یوں کہنا چاہیے تھا۔ یہ خود کلامی، قدرے شاعرانہ اداکاری کے ساتھ، قاری کو واقعے کے بجائے اسلوب کی نمائش کی طرف موڑ دیتی ہے اور ’کہانی پن‘ کے بجائے ’جملہ پن‘ غالب آ جاتا ہے۔ اس طرح کی خود تصحیحی ترکیبیں بیانیے میں خطی تناؤ کی بجائے لسانی دھیان کو بڑھاتی ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں زبان افسانے کے حقیقی مرتبے سے اوپر اٹھنے کی کوشش میں دھڑام سے جا گرتی ہے۔

تیسرا نمایاں نمونہ افسانے کے اندر افسانے پر تبصرہ، یعنی افسانے کی کمزوری کے داغ چھپانے کے لیے بنایا گیا بیانیہ جو افسانے کے بنیادی دائرے ہی سے قاری کو باہر کھینچ لیتا ہے۔ ’شاخِ اشتہا کی چٹک‘، ’’مگر میری کہانی کا المیہ یہ ہے کہ اپنے خاتمے پر اس سے سارا رومان اور لذت منہا ہو گئی ہے‘‘۔ جیسے جملے افسانے کو خود اس کی ہیئت سے ہٹا کر لکچر کی طرف دھکیلتے ہیں۔ قاری کا تعلق کردار و واقعے سے کٹ کر مصنفانہ شعوری کوشش کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ یہی دفاعی تبصرہ جملوں کی ساخت کو طویل، نحوی بندش کو پیچیدہ اور ہضم کو مشکل کرتا ہے۔ فعل کی لچک گھٹتی ہے اور مجرد اسمیت بڑھ جاتی ہے۔

چوتھا رجحان معنوی تجرید اور صوفیانہ اصطلاحات کی باہمی گرہ بندی ہے جس سے جملے وزن تو پکڑنے کی سعی کرتے ہیں مگر قصے کی حرکی توانائی کم ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ ’مرگ زار‘ کے حوالے سے محمد سلیم الرحمن نے جو اقتباس نقل کیا، اس کی ساخت پر غور کیجیے:

’’میں بچھڑے ہوؤں کو اتنا یاد کرتا ہوں کہ اندر کا کافر دل پسیج کر ایمان اور زمین سے وابستہ جذبوں کو ڈھونڈ نکالتا ہے‘‘۔

یہاں ’اندر کا کافر دل‘، ’ایمان‘، ’زمین سے وابستہ جذبے‘ جیسی پرت دار علامتیں ایک ہی جملے میں یوں گھلتی ملتی ہیں کہ لفظی گھناپن اور معنوی سطحیت ساتھ ساتھ بڑھتی ہے اور یہی شے امیج اور ایکشن کی سطح کو دھندلا دیتی ہے۔ جملہ شاعری کی جانب لپکتا ہے اور واقعاتی خط از خود دھیمی رو ہو جاتا ہے۔ زبان کے اس وقار میں کرختگی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب علامتی اظہار پے در پے استعاروں میں بدل جائے اور قاری کو مواد کی نشانیوں کا نقشہ ذہن میں بناتے بناتے سانس پھولنے لگے۔

ان مثالوں سے مجموعی پیٹرن صاف جھلکتا ہے۔ ایک طرف منظر نامہ نگاری میں فہرستیں، اضافت در اضافت تراکیب اور صفتوں کی قطاریں، دوسری طرف ’میں کہانی کہہ رہا ہوں‘ والی جعلی خود آگہی اور تیسری طرف حکیمانہ، مقولہ انگیز جملے جو قاری کو کہانی سے اٹھا کر کاتب کے ذہن میں بٹھا دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ نحوی ساختیں طویل ہو کر کسالت پکڑتی ہیں، فعل کم اور اسم و صفت کی بھیڑ زیادہ ہو جاتی ہے، اور بیانیہ اندرونی موسیقیت کھو بیٹھتا ہے۔ اس سے ’ہضم ہونے‘ کی دشواری بڑھتی ہے۔ بعض مقامات پر جملوں کا دروبست اتنا بھاری اور بوجھل ہو جاتا ہے کہ قاری کو اس کے جوڑ توڑ میں بہت ہی زیادہ محنت کرنا پڑتی ہے کہ پورا واقعہ ایک غیر ضروری اور غیر تخلیقی ملبے تلے دب کر رہ جاتا ہے۔

یہی وہ فنی مقام ہے جسے ہم زبان کی ’خوب صورتی سے کرختی تک‘ کا سفر کہہ سکتے ہیں۔

مجھے یہاں یہ کہنا ہرگز مقصود نہیں کہ افسانے میں شعریت کا لمس حرام ہے، افسانہ نثری شعریّت کا ہلکا سا رنگ دے سکتا ہے، مگر خود نثری نظم میں نہیں ڈھل سکتا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ محمد حمید شاہد نے اپنی کبھی کبھار کی نثری نظم کے شوق کو افسانے میں بھی اتنا غالب رکھا کہ کہانی، زبان اور تمثیل بُری طرح متاثر ہوئی۔ افسوس یہ کہ اردو ادبی فضا میں تعریف و توصیف کے کاروباری مزاج نے اُن تک وہ سخت اور خیر خواہ تنقید پہنچنے ہی نہ دی جس کی نشاندہی انہیں بتاتی کہ یہی اُن کے اسلوب کی بنیادی کجی ہے۔

کمال یہ ہے کہ منشایاد کی نثر ہر افسانے میں ایک نئی سانس لیتی ہے کبھی وجودی کائنات کی وسعت میں لہروں کی طرح پھیلتی ہے، کبھی گھر کی چار دیواری کے روزمرہ میں دبے پاؤں آ کر دل کی دھڑکن سن لیتی ہے، اور کہیں دیہی محاورے کی مٹی سے ایک تازہ پودا اگا دیتی ہے۔ زبان کے یہ رنگ صرف بیان کی خوش نمائی نہیں بنتے، استعارہ، محاورہ اور مصوری مل کر اس آواز کو جنم دیتے ہیں جسے ہم منشایاد کی اپنی آواز کہتے ہیں۔

یعنی منشایاد کی زبان حسنِ بیان کے شور میں گم نہیں ہوتی، وہ معنی کی خدمت گزار رہتی ہے، اسی لیے ان کے افسانوں میں تمثیل ہو تو سانس بھی ساتھ چلتی ہے، شعریت ہو تو قصہ بھی ساتھ بڑھتا ہے، اور جہاں دیہی مٹی کی خوشبو آئے وہاں کردار اور لفظ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے دکھائی دیتے ہیں۔ یہی وہ تنوع اور ضبط ہے جو ان کے نثری کانٹینٹ کو خوب صورتی بھی دیتا ہے اور دیرپا وقعت بھی۔

E-mail: abraromer60@gmail.com
Phone No. : +923369172267

◆◆◆

’تماشا‘ اور ’رُکی ہوئی زندگی‘
منشایاد اور حمید شاہد کی افسانوی زبان کا تقابل

ڈاکٹر ابرار عمر

محمد حمید شاہد کے ’رُکی ہوئی زندگی‘ میں نثر بارہا افسانے کے بدن سے باہر نکل کر ’زبان بر زبان‘ ہو جاتی ہے، جملے طول پکڑتے ہیں، اسمیت کا بوجھ افعال کو پیچھے دھکیل دیتا ہے، صنعتیں اور مجہول تراکیب معنی پر غالب آجاتی ہیں اور جملے اندرونی شاعرانہ نمائش میں ایسے مگن ہوتے ہیں کہ منظر کا سانس گھٹ جائے۔ اس کے مقابل منشایاد کے ’تماشا‘ میں مختصر، قاطع افعال، علاقائی لَے اور منظر کی حسیّت سے مفہوم خود جنم لیتا ہے یہی سادگی قاری کے اعصاب کو فوراً اپنی گرفت میں لیتی ہے۔

’رُکی ہوئی زندگی‘ کی پہلی ہی لڑی میں زبان کا دکھاوا منظر سے آگے نکل آتا ہے۔ مثال دیکھیے: ’’عاطف اسے دیکھ رہا تھا، ہک دک۔ کراہت کا گولا پیٹ کے وسط سے اُچھل اُچھل کر اس کے حلقوم میں گھونسے مار رہا تھا، یوں کہ اسے ہر نئے وار سے خود کو بچانے کے لیے دھیان اِدھر اُدھر بہکانا اور بہلانا پڑتا‘‘۔ یہاں افعال کی رفتار موجود سہی، مگر فقرہ اس قدر بھر دیا گیا ہے کہ حالت، سین کو ڈھانپ لیتی ہے۔ لفظی نشانات، صوتی دھماکے، اور مجہول کیفیتیں (کراہت کا گولا.. گھونسے مار رہا تھا) جملے کو خطیبانہ بناتے ہیں، افسانوی نہیں۔ اسی صفحے پر ’’وقت کی سفاکی نے سب کچھ مٹا کر ایک نئی تحریر لکھ دی تھی۔ ایسی تحریر جو پورے بدن میں اضمحلال بھر رہی تھی‘‘ یہ تحریر کی تمثیل اور اضمحلال کی نظری لغت مل کر جملے کو مقالہ بنا دیتی ہے اور کردار کی مٹی ہاتھ سے پھسل جاتی ہے۔

افسانے میں اسمیت کا دباؤ مسلسل افعال کی سانس پر بھاری رہتا ہے ’’عادت کی ڈوری میں بندھا بدن دُکھتا تھا... دونوں میں ہمت نہ تھی کہ وہ معمول کے اس دائرے کو توڑ ڈالیں‘‘۔ یہاں عادت، ڈوری، بدن، معمول اور دائرے کی سطحی جدلیات، سننے میں خوش آہنگ ہونے کے باوجود، عمل کی یک سمتی کو نظری اصطلاحات کی سیڑھی پر چڑھا دیتی ہے۔ فوراً بعد ’ایمپورٹیڈ باڈی لوشنز اور پرفیومز اور ٹشو پیپرز کا ڈھیر‘ جیسی فہرست نگاری در آتی ہے۔ فہرستیں اگر سین کے اندر گھل جائیں تو قوت بنتی ہیں، مگر جب فہرستیں خود منظر بن بیٹھیں تو افسانہ محض شے نامہ ہو جاتا ہے۔ ’’پورا کمرا، ایمپورٹیڈ باڈی لوشنز اور پرفیومز سے مہکنے لگتا... ویکسنگ اور پفنگ کے بعد بلش آن‘‘... یہ سب تفصیل ہے، مگر معنی اپنے پاؤں پر نہیں کھڑا ہوتا، قاری کو اشیا کی ریل میں گھومنا پڑتا ہے۔

اسی لڑی کی نحوی گرہیں ملاحظہ ہوں: ’’وہ جذبے... دھاگے کا سرا... گرہ پر گرہ دیے چلی جاتی‘‘ جیسا جملہ بندھی ہوئی تمثیلوں کے بوجھ سے بھاری ہے، افعال (دیے چلی جاتی) محض گرہ کی خدمت کرتے ہیں، کردار کی حرکت نہیں بناتے۔ پھر طویل تشبیہ ’’ایسا شور... جو سکوت میں ڈھل جاتا ہے... یا پھر ایسا شور جو... سماعتوں کو بند کر دیتا ہے‘‘ یہ صناعی اپنی جگہ خوب، مگر افسانے کے دوران اس کی کثرت نثر کو نثری نظم کا سا مزاج دے دیتی ہے۔ پھر وہی ’کچوکوں سے بیدار ہونے‘ والی صورتِ بیان اور لسلسا کیڑا‘‘ کا تصویری بہاؤ قائم ہے لیکن کہانی کی گرفت ادھر ادھر ہو جاتی ہے قاری کے سامنے صورتِ واقعہ کی بجائے صورتِ بیان‘‘ کھڑی نظر آتی ہے۔

اب اسی کے مقابل ’تماشا‘ کی زبان کا خالص افسانوی پن دیکھیے۔ ابتدا ہی میں دو چھوٹے جملے قاری کے حواس پر چاقو کی طرح چلتے ہیں: ’’اندھیرے کا طویل سفر طے کرنے کے بعد وہ سورج طلوع ہونے تک دریا کے کنارے پہنچ جاتے ہیں۔ کنارے پر جگہ جگہ ادھ کھائی اور مری ہوئی مچھلیاں بکھری پڑی ہیں‘‘۔ یہاں نہ تحریر، معنی، اضمحلال جیسے مجہول الفاظ ہیں نہ فہرست کی بناوٹی ریل صرف منظر ہے، اور منظر سے اٹھتا مفہوم۔ اگلی ہی سطروں میں محاورہ اور اخلاقی نتیجہ سیدھے لہجے میں کھلتا ہے یہ لدھروں کی کارستانی لگتی ہے ’’ابا... ضرورت سے زیادہ مچھلیاں مار مار کر جمع کرتے رہتے ہیں مگر کھاتے وقت آپس میں لڑ پڑتے ہیں‘‘— مختصر، کاٹ دار، اور بے تکلف۔

’رُکی ہوئی زندگی‘ میں صوتی اور حسی الفاظ کی بھرمار بسا اوقات ’تماشا‘ گری بن جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ’’جبڑوں اور ہونٹوں کے باہم ٹکرانے کی آوازیں مسلسل آ رہی تھیں... چپڑ چپک چپڑ چپاک‘‘ یہ سب سلتیاں اور چپٹیں آوازیں ہی آوازیں ہیں سین کی حرکت ثانوی ہو جاتی ہے، بدن آواز میں ٹوٹتا دکھایا جاتا ہے، معنی پیچھے رہ جاتا ہے۔ پھر ’’بدن... کچوکوں سے بیدار ہونے والا... جیسے لسلسا کیڑا‘‘ یہ تشبیہ اپنی شدت سے دھکا تو دیتی ہے مگر کردار کے انسانی تنازع کو حشر زدہ اور میلوڈرامائی کر دیتی ہے، حساسیت جس نرمی سے آنی تھی نہیں آتی بلکہ کراہ کی گرہ میں پھنس جاتی ہے۔

اس کے بالمقابل ’تماشا‘ میں افعال کی کوتاہی بیانیہ کو قدموں کی تال دیتی ہے۔ ’’اللہ کا نام لے کر ٹھل پڑتے ہیں پتر... جیسے تمھاری مرضی ابا‘‘ دو جملے اور پورا حرکت نامہ تیار۔ پھر علامت سین سے جنم لیتی ہے، باہر سے نہیں لادی جاتی، ’’پل آگے ہی آگے چلتا جاتا ہے... مینار ہمارے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں‘‘۔ دو تصویری فقرے پوری تہذیبی بے سمتی ایک لمحے میں قاری کے اندر پیوست کر دیتے ہیں۔

’رُکی ہوئی زندگی‘ میں اسمیت و مجہول تراکیب کی کثرت بھی ہضم پذیری کم کرتی ہے۔ ’معمول، دائرہ، سکوت، دہشت کا طالح تناؤ‘ یہ سب بڑے الفاظ ہیں، مگر جب ایک ہی سانس میں سجے ہوں تو افسانہ خطیبانہ عبارت ہو جاتا ہے۔ کہیں ’پورا کمرا ایمپورٹیڈ پرفیومز سے مہکنے لگتا‘ یوں اشیا کی فہرست ’روزمرّگی‘ دکھاتی ہے، مگر سین کو آگے نہیں دھکیلتی کردار کی داخلی کشمکش اشیا کی سجاوٹ میں دب جاتی ہے۔ نتیجہ یہ کہ قاری بطورِ نقاد تیز بھاگتا ہے مگر بطورِ ناظر پیچھے رہ جاتا ہے۔

’تماشا‘ میں سماعت اور فضا سے مفہوم اٹھتا ہے۔ باپ کے خواب کے بیچ ایک سادہ مگر لرزا دینے والی تصویر... ’’کتے رو رہے ہیں اور اوس سے بوجھل ہوا اداس اداس پھر رہی ہے‘‘ یہاں نہ صنعت کی خودنمائی ہے نہ نظری اصطلاح خالص فضا ہے جو قاری کے اعصاب پر براہِ راست اثر کرتی ہے۔ پھر سفر کا زمان و مکان محض ایک سطر میں گونج اٹھتا ہے ’’راستہ مشکل ہے... مگر وہ چلتے رہتے ہیں‘‘۔ یہی ادبی کفایت افسانے کو تجربہ بناتی ہے تجربہ کا بیان نہیں۔

محمد حمید شاہد کی نثر میں ایک اور کمزوری جسے میں دانستہ کرختگی کہہ رہا ہوں یہ ہے کہ نحوی گرہیں اور متوازی ترکیبیں جملے کو زبتی تپش تو دیتی ہیں مگر افسانوی خون کم کر دیتی ہیں۔ مثال دیکھیے: ’وہ ایسی عورتوں میں سے تھی نہیں... اسے تو خود آغاز چاہیے تھا، بھیگا ہوا آغاز‘ یہ ’بھیگا ہوا آغاز‘ جیسی مبہم رومانیات سننے میں خوب صورت مگر منہ زور ہے اور سین کی دقیق حرکت اس لہجے کے نیچے دب جاتی ہے۔ اسی طرح ’سکوت تنا ہوا تھا۔ گاڑھا، گھمبیر اور گھمس والا سکوت‘ یہ تین تہیں نغمگی تو بڑھاتی ہیں، مگر اس مقداری تکرار میں خالی پن کی تھرتھراہٹ جزوی طور پر کھو جاتی ہے۔

اس کے الٹ ’تماشا‘ میں علاقائی گیت تک بیانیہ کی خدمت میں ہے، خودنمائی نہیں... ’’نیں وی ڈونگھی تلہ شینھاں تاں پتن ملے (ندی گہری اور کشتی پرانی ہے...)‘‘ یہ گنگناہٹ کسی نظری بحث میں نہیں بہتی بلکہ سین کو مصنوعی تاثر سے بھر دیتی ہے اور کرداروں کی اخلاقی جسارت کو آہستہ سے بے نور کرتی ہے۔

اب ایک اور جوہری فرق دیکھیے: ’رُکی ہوئی زندگی‘ میں اکثر جملہ شے، خوشبو، آہنگ، تحریر ’’جیسی خارجیت سے معنویت گھڑتا ہے اور کردار کی اندرونی دھڑکن گھن گرج میں گم رہتی ہے۔۔۔‘‘ ...(بقیہ صفحہ 6 پر)

ادارے کا مضمون نگاروں کی آرا سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے (ادارہ)

مدیر : اطہر فاروقی
Editor : Ather Farouqui
شریکِ مدیر: محمد عارف خاں
Joint Editor : Mohd. Arif Khan
پرنٹر پبلشر : عبدالباری
Printer Publisher : Abdul Bari
مطبوعہ : جاوید پریس، 2096، رودگراں، لال کنواں، دہلی-۶
مالک : انجمن ترقی اردو (ہند)
اردو گھر، 212، راؤز ایونیو، نئی دہلی-110002
Proprietor:
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)
Urdu Ghar, 212-Rouse Avenue,
New Delhi-110002
قیمت : فی شمارہ: پانچ روپے، سالانہ: 200 روپے
بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر
Subscription: (Per Issue): Rs. 5/-, Annual: 200/-
(Foreign Countries: US $ 8)
E-mail: hamarizaban.weekly@gmail.com
http://www.atuh.org,
Phones: 0091-11-23237722

Printed and Published by ***Abdul Bari*** on behalf of Anjuman Taraqqi Urdu (Hind), Urdu Ghar, 212, Rouse Avenue, New Delhi-110002
and Printed at Javed Press, 2096, Rodgran, Lal Kuan, Delhi-110006, Editor: ***Dr Ather Farouqui***